فرد

شمارہ نمبر ۱۱ مئی ۲۰۱۶ء

انڈو یجوئل لینڈ
انفرادی آزادی کے لئے کوشاں

بادشاہت، آمریت یا جمہوریت؟

جمہوریت

مقامی حکومتیں

پانامہ

اقلیتیں

لائحہ عمل

بنیادی سہولیات

پابندیاں

آمریت

جمہور

سرکاری اور غیر سرکاری ادارے

آئین اور قوانین

نجکاری

دھرنے اور احتجاج

پیمرا

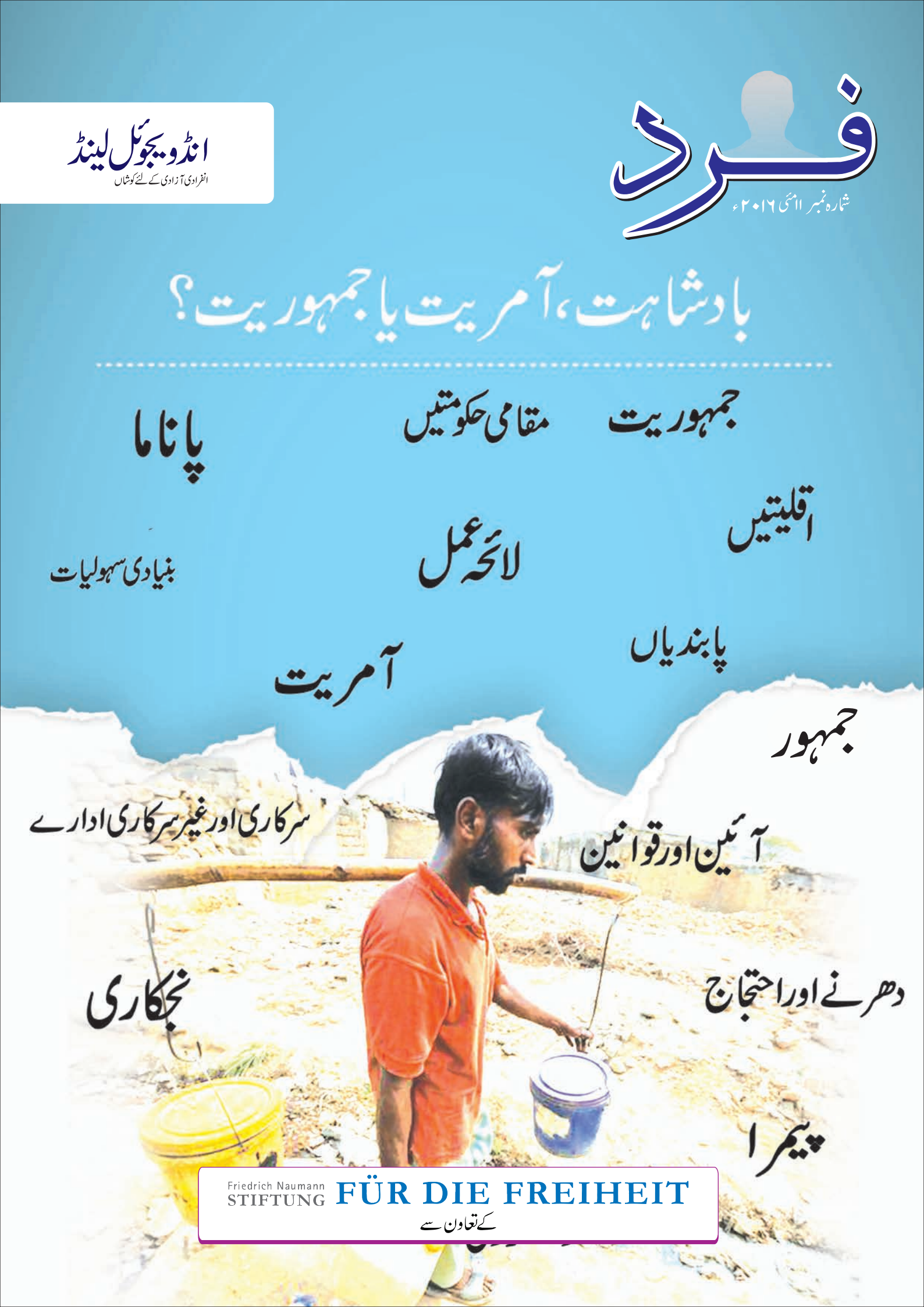

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
کے تعاون سے

فرد

شمارہ نمبر ۱۱ مئی ۲۰۱۶ء

ایڈیٹر:
سندس سیدہ

کوارڈینیشن: اویس محمود
سید فہد الحسن

ڈیزائن
عدیل امجد، ڈاٹ لائنز

پبلشر:
انڈویجوئل لینڈ پاکستان

آئی ایس بی این ۰ ۴۰ ۹۵۸۲ ۹۶۹ ۹۷۸

فہرست

ازطرف مدیر	
ضابطہ اخلاق اور میڈیا کی آزادی	۱
کیا نجکاری وقت کی ضرورت ہے؟	۳
موسمیاتی تبدیلی	۵
مذہبی اقلیتیں اور ہمارا معاشرہ	۷
تیسری صِنف کی مشکلات	۹
بک ریویو	۱۳
مقامی حکومتیں اور ان کی ذمہ داریاں	۱۷
بے گھر افراد گھر کیوں نہیں جانا چاہتے؟	۱۹
۲۳ مارچ کو ہی مارچ کیوں؟	۲۲
نیشنل ایکشن پلان کا ایک جائزہ	۲۴
پانامہ ہنگامہ	۳۰
خواتین کے تحفظ کا بل	۳۴
داعش کی پاکستان میں موجودگی: ایک سوال	۳۶
عوام کی نمائندگی کون کرے گا؟	۳۸

ترکِ دعویٰ

یہ کتاب فریڈرک نومین فاؤنڈیشن فار فریڈم کے تعاون سے شائع کی جارہی ہے۔ اس اشاعت میں بیان کی گئی آرا سے فریڈرک نومین فاؤنڈیشن فار فریڈم کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اور اس کتاب میں شامل تمام مواد کی ذمہ داری انڈویجوئل لینڈ پاکستان کی ہے۔

Individualland
Creating space for the individual
289 السٹونیا ایونیو، سفاری ولا زفیز 3 بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
کے تعاون سے

از طرف مدیر

اسلامی جمہوریہ پاکستان کی عوام اس وقت بدعنوانی، دہشت گردی، احتجاجی دھرنوں اور مظاہروں، دہشت گردی کے خلاف فوجی آپریشن، بین الاقوامی ایجنسیوں کی مداخلت اور اس طرح کے کئی مسائل سے دوچار ہے۔ مالی غبن اور ٹیکس چوری بھی انہی مسائل میں سے ایک ہے، جس کے لیے بے شمار طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں پاناما لیکس میں کچھ انکشافات سامنے آئے ہیں جن کے مطابق پاکستان کے شہریوں نے ملک سے باہر آف شور کمپنیاں قائم کی ہوئی ہیں جس کے لئے الزام لگائے جا رہے ہیں کہ غیر قانونی طریقے سے پاکستان سے دولت باہر بھیجی گئی اور ٹیکس ادا نہیں کیا گیا۔ اگر یہ الزامات درست ہیں تو یقیناً وہ ادارے برابر کے ذمہ دار ہیں جو ملک میں مالیات کے نظام اور ٹیکس وصولی کی مانیٹرنگ کرتے ہیں۔ ان اداروں کے ملازمین حکومت سے تنخواہ لیتے ہیں اور ایک کثیر بجٹ ان کے لئے مختص کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ غفلت برتتے ہیں اور اپنے امور کی سرانجام دہی میں بدعنوانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ٹیکس چوری کے مرتکب افراد سے پوچھ گچھ کرنا اور حقائق کو قوم کے سامنے لانا کس کی ذمہ داری ہے؟

پاکستان کے دوسرے اہم مسائل میں ایک اہم مسئلہ عسکریت پسندی ہے جس سے نمٹنے کے لیے حکومت ایکشن پلان اور حکمتِ عملی بنانے اور اسکے نفاذ میں مصروف عمل دکھائی دیتی ہے۔ پاکستان میں قانون کا نفاذ اگرچہ ایک مستقل مسئلہ ہے مگر پھر بھی قانون سازی ہو رہی ہے اور کہیں نہ کہیں قانون پر عمل درآمد بھی دکھائی دیتا ہے۔ مگر عسکریت پسندی کے اس ناسور کو ختم کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

گزشتہ چند سالوں سے عوام کو ملک میں دھرنوں اور مظاہروں کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ اگرچہ حکومت سے مطالبات منوانے کے لیے دھرنا دیا جاتا ہے اور پھر مطالبات کے تسلیم کرنے پر ختم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن احتجاج کے نتیجے میں ملک کی املاک کو تباہ و برباد کرنا یا جلانا اور اپنے ہی ٹیکس کے پیسوں سے کھڑے کیے گئے انفراسٹرکچر کو تباہ کرنا کس طرح کے رجحان کو ظاہر کرتا ہے؟ صورتحال جیسی بھی ہو، عوام خود اپنے لیے یا پھر عوام کے نام پر آواز اٹھانے والے رہنما ہی عوام کے لیے مشکلات میں اضافہ کرتے ہیں۔ لوگوں کے کسی بھی جارحانہ عمل سے ان ہی طرح کے دیگر لوگوں کی زندگی منجمد ہو جاتی ہے۔ عوام بلا سوچے سمجھے اپنے ہی سرمائے کو آگ لگاتی ہے اور اپنے لیے مزید دشواریاں پیدا کر دیتی ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ہمارے سرمایہ دار لوگ پاکستان میں سرمایہ کاری کرنے کو ترجیح دینے کی بجائے بیرونِ ملک سرمایہ کاری کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ملک میں جمہوریت کا تسلسل ۲۰۰۸ء سے ہے مگر عوام تک ابھی بھی جمہوریت کے ثمرات نہیں پہنچ پا رہے جس کی وجہ سے ملک میں طرزِ حکمرانی اور جمہوریت پر بھی سوال پیدا ہو رہے ہیں۔ کہنے کو تو ہمارا ملک ایک جمہوری ملک ہے لیکن کیا واقعی ہماری جمہور کے پاس وہ اختیارات ہیں جو کسی بھی جمہوری ملک میں ہونے چاہیے؟ احبابِ اقتدار کو یقیناً سوچنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں اسلوبِ حکمرانی سے متعلق انہی امور کو سامنے رکھتے ہوئے 'فرد'' میگزین کے اس شمارہ میں انڈ و یجوئل لینڈ کی ٹیم کی جانب سے کوشش کی گئی کہ چند اہم عنوانات کو ایک نئے انداز میں پیش کیا جائے۔ پڑھنے والوں کا ان خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ نظر و فکر میں پائے جانے والے اسی تنوع کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔

سندس سیدہ

ضابطہ اخلاق اور میڈیا کی آزادی

تحریر: ذوالفقار حیدر

ابصار عالم جب سے پیمرا کے چیئرمین تعینات ہوئے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ نجی ٹی وی چینلز کی گویا شامت ہی آ گئی ہو۔ کبھی کسی چینل پر جرمانہ تو کبھی کسی چینل کو نوٹس، یوں لگتا ہے جیسے ابصار بھائی کو میڈیا والوں کا کاروبار ٹھپ کروانے کے مشن پر بھیجا گیا ہے۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ بہت جلد میڈیا کی بڑی بڑی شخصیات جنید جمشید کی طرح گارمنٹس کی دکانیں کھولنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔ ویسے تو گارمنٹس کے کاروبار میں بھی بڑا فائدہ ہے، خاص طور پر اگر آپ عوامی حلقوں میں پہلے سے مشہور ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاہد آفریدی نے بھی کرکٹ چھوڑنے سے پہلے اسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا بہتر سمجھا۔

خیر چھوڑیں گفتگو کا رُخ واپس پیمرا کی جانب موڑتے ہیں۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق پچھلے تین ماہ میں پیمرا نجی ٹی وی چینلز کو تیس لاکھ سے زائد جرمانہ کر چکا ہے۔ یہ جرمانے میڈیا قواعد کی خلاف ورزیوں کے الزامات یا غلطیوں کی بنیاد پر کیے گئے جن میں مذہبی تعصب کو ہوا دینے سمیت نیشنل ایکشن پلان کی خلاف ورزیوں جیسے الزامات شامل ہیں۔ ویسے اگر آپ اس معاملے پر میری رائے جاننا چاہتے ہیں تو میں یہی کہوں گا کہ پچھلے تیرہ سالوں میں پیمرا نے پہلی بار اپنے فرائض کی ادائیگی شروع کی ہے۔ اب ظاہری سی بات ہے کہ جنہیں کھلے میدان کی عادت تھی انہیں اب ایک کمرے میں رہنے سے تھوڑی تنگی تو لازماً ہوگی۔ پہلی دفع یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میڈیا کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

یقیناً میڈیا کی آزادی پر غیر ضروری قدغن لگانے اور اسے ایک ضابطۂ اخلاق کا پابند بنانے میں بہت فرق ہے۔ میڈیا کی آزادی پر پابندیاں تو اس وقت لگائی جاتی ہیں جب کسی ملک کے طاقتور حلقوں کو یہ خوف محسوس ہونے لگتا ہے کہ میڈیا کہیں اُن کی کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کو فاش نہ کر دے۔ جبکہ میڈیا کو ایک ضابطۂ اخلاق کا پابند کروانے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب یہ اپنی حد سے تجاوز کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حال ہی میں جیو کہانی اور اے آر وائی کے جن دو پروگراموں پر جرمانہ عائد کیا گیا تو اُس کا مقصد قابلِ اعتراض زبان کے استعمال کو روکنا تھا۔

اسی طرح نیشنل ایکشن پلان کے تحت مذہبی تعصب کو ہوا دینے والے پروگراموں اور میزبانوں کو بھی جرمانے کیے گئے۔ یہاں تک کہ اُن جلسوں اور احتجاجوں کی لائیو کوریج پر بھی پابندی لگائی گئی جو مذہبی اشتعال پھیلا رہے تھے یا سرکاری احکامات کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ جیسا کہ حال ہی میں ممتاز قادری کے جنازے اور اُس کے بعد اُس کے چہلم پر نکالے جانے والے احتجاجوں کی لائیو کوریج سے ٹی وی چینلز کو روک دیا گیا۔ اس پابندی کے نتیجے میں چند چینلز کے دفاتر پر حملے بھی ہوئے اور اُن کے سٹاف کو بھی تشدد کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس کے باوجود ان چینلز نے پابندی کو قبول کیا۔

اسی طرح چند ماہ پہلے سعودی عرب اور ایران کے درمیان ابھرتے ہوئے اختلاف یا تنازع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیمرا نے تمام چینلز کو غیر ضروری تبصروں سے منع کیا، جس کی بنیادی وجہ ملک میں موجود مختلف مسالک کے مابین کسی بھی قسم کے ممکنہ تنازعہ کو روکنا تھا۔ اس کے علاوہ ٹی وی چینلوں کے بہت سے ایسے پروگراموں پر بھی پابندیاں لگائی جارہی ہیں جن میں مختلف جرائم کے واقعات کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان اقدامات کا مقصد ایسے پروگراموں میں عوام کی نجی زندگیوں میں مداخلت، غیر اخلاقی اقدامات کی تشہیر اور معاشرتی اقدار کی خلاف ورزی کو روکنا ہے۔ حال ہی میں ایک نجی ٹی وی چینل کے میزبان ڈاکٹر شاہد مسعود کی جانب سے وزیر اطلاعات کے خلاف بھی شکایت درج کروائی گئی جس پر پیمرا نے نوٹس لیا اور مزید کاروائی کے لئے شکایات کو کونسل کے حوالے کر دیا۔

یقیناً پیمرا کی جانب سے یہ تمام کاروائیاں بہتری کی جانب ایک پہلا قدم ہیں مگر اس کے ساتھ اس بات کی طرف بھی دھیان رہے کہ پیمرا کی یہ کاروائیاں میڈیا کی آزادی کو کم کرنے کی کوئی کوشش نہ ہوں۔ کیونکہ ایک آزاد اور خودمختار میڈیا ہی جمہوریت اور ایک مضبوط ریاست کی ضمانت دیتا ہے۔ پاکستان تاریخ کے ایک نازک موڑ سے گزر رہا ہے اور اس کی بقاء کے لئے ایک آزاد اور خودمختار میڈیا کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ریاست کے دیگر اداروں کا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ میڈیا میں اس نازک توازن کو قائم رکھا جائے تاکہ ملک مزید بہتری کی جانب گامزن ہو سکے۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

کیا نجکاری وقت کی ضرورت ہے ؟

تحریر: سندس سیدہ

بجلی اور گیس کی کمی کے باعث پاکستان میں یہ صورتحال ہے کہ جب گیس چاہیے تو گیس نہیں ملتی اور جب بجلی چاہیے تو وہ بھی ناپید۔ گیس نہ ہونے کہ وجہ سے چولہے ٹھنڈے پڑے ہیں جبکہ بجلی نہ ہونے کے باعث کوئی بھی مشینری کام نہیں کر پا رہی۔ ظاہر ہے اگر ایندھن مہیا نہیں کیا جائے گا تو نہ ہی چولہا جل سکے گا اور نہ ہی کوئی کاروبار۔ اس طرح ایک گھر کے اندر بسنے والے مکین کئی بنیادی سہولیات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایک عام فرد تو اس صورتحال سے دوچار ہے مگر جب ملک کے اہم قومی اداروں اور صنعتوں کو اس قسم کے مسائل کا سامنا ہو تو اس صورت میں نقصان کے ذمہ داران کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پاکستان اسٹیل مل، جو ایک اہم قومی ادارہ ہے، جہاں گیس فراہم نہ کرنے کی وجہ سے مشینیں بند پڑی ہیں اور بجلی کی کمی کی وجہ سے مطلوبہ پیداوار حاصل نہ ہونے سے مسلسل خسارے میں جا رہا ہے، ایسی صورت میں اس کی بربادی کا ذمہ دار کس کو ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ وہ ادارہ جو ملک کی ضرورت کا پچاس فیصد پورا کرتا تھا اس کو ہفتہ وار پچاس لاکھ ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ یہ ذمہ داری صرف حکومت پر ہی عائد نہیں ہوتی بلکہ کمپنی کے خسارے کے پیچھے کرپشن اور بدعنوانی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ سٹیل مل میں کام کرنے والے اعلیٰ عہدیداروں کی من مانیوں کی وجہ سے کمپنی کو اربوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑا جس کے اثرات اور نتائج کمپنی کو اور چھوٹے ملازمین کو برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ جہاں بے شمار ملازمین کو اس نقصان کی وجہ سے ملازمت سے محروم کیا جا چکا ہے۔

حکومت سٹیل مل پر اربوں ڈالر خرچ کر چکی ہے۔ مگر اب پرائیویٹ سیکٹر کو اس میں سرمایہ کاری کرنے کی ضرورت ہے تا کہ ملک کو مزید نقصان سے بچایا جا سکے۔ پاکستان میں بے شمار سٹیل کمپنیاں کام کر رہی ہیں اور حال ہی میں چنیوٹ رجوعہ سے برآمد ہونے والے خام لوہے کی ذخائر کے بعد پنجاب میں سٹیل مل کے قیام کے بارے میں مشورہ دیا جا رہا ہے۔ لیکن دوسری جانب صورتحال یہ ہے کہ اس وقت پاکستان سٹیل مل کی بقاء کو ہی خطرہ لاحق ہے۔ وفاقی حکومت کی جانب سے اس کی نجکاری کی کوششیں جاری ہیں لیکن بین الاقوامی خریدار اس کی قیمت کوڑی کے دام لگا رہے ہیں اور سندھ حکومت نے بھی ابھی تک خاموشی سادھ رکھی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے کیونکہ اطلاعات کے مطابق ۲۰۱۶ء جون میں سٹیل مل کو بولی کے لیے پیش کیا جائے گا اور ستمبر کے آخر تک اس کی نجکاری مکمل ہو جائے گی۔

پاکستان کی ایک اور بڑی کمپنی جس کا سلوگن ہے "*ناکمال لوگ لاجواب سروس*"۔اس کمپنی کی صورتحال یہ ہے کہ وہ کرپشن، ناقص پالیسیوں اور سیاسی مداخلت کی بدولت خسارے میں جارہی ہے۔حکومت پہلے ہی پاکستان سٹیل مل پر اربوں روپے خرچ کرچکی ہے اب اگر وہ پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائن کے قرضوں کا بوجھ بھی اٹھالیتی ہے پھر بھی اس بات کی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ یہ قومی ایئرلائن دوبارہ پاکستان کو منافع دے پائے گی۔اس کی ایک بڑی وجہ اداروں میں بدعنوان اور کرپٹ عناصر کی موجودگی ہے۔اگر ان کرپٹ لوگوں کا احتساب نہیں کیا جاتا جن کی وجہ سے کمپنی یا ادارے کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کی زد میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو مخلص ہیں اور کسی قسم کے غلط کام نہیں کررہے۔اس وقت پی آئی اے کی صورتحال یہ ہے کہ سیاسی بھرتیوں کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ سٹاف کام کررہا ہے جو ادارے پر ایک خاصا بوجھ ہے۔پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائن میں یہ بھرتیاں کیسے ہوئیں اس کے لئے میں اپنی مثال دیتی ہوں، کیونکہ میں نے جب ایک بار اس ادارے میں بھرتی کے لئے انٹرویو دیا تھا تب مجھے بھی فون پر کہا گیا تھا کہ اگر نوکری چاہئے تو مجھے کچھ رقم جمع کروانی ہوگی۔اگر محض بھرتیوں کے لئے اتنی رقم کرپشن کی صورت میں لی جارہی ہو تو باقی انتظامی امور میں کس حد تک کرپشن کی جارہی ہوگی؟ اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

۲۰۰۴ء تک منافع دینے والی ایئرلائن جس کو معیار، بروقت روانگی اور تربیت کے حوالے سے دنیا بھر میں خاص اہمیت حاصل تھی، اس نہج پر آگئی ہے کہ کوئی بھی اس میں سفر کرنے کو ترجیح نہیں دیتا۔ایئرلائن کے عملے کے رویوں سے بھی برا اس کے جہازوں کا حال ہے۔اسکول کے زمانے میں ہم نے مرزا کی سائیکل کے نام سے ایک کہانی پڑھی تھی، بالکل اسی طرح اس کے جہازوں کی حالت ہے۔ایئرلائن کے جہازوں کی ہنگامی لینڈنگ کی خبر سن کر لگتا ہے کہ مرزا کی سائیکل کی طرح ان کے پرزے بھی آہستہ آہستہ گرتے جارہے ہیں۔ جہاز میں بیٹھے سینکڑوں لوگوں کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوتی ہیں اور خاص کر جب ان جہازوں کو "جہاز" نشے میں دھت پائلٹ چلا رہے ہوتے ہیں۔فلائٹ کے روانہ ہونے سے پہلے جہاز کے اندر کا منظر یہ ہوتا ہے کہ جیسے کسی گھر میں لوگ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے دستی پنکھے جھول رہے ہوتے ہیں۔ہمارے ملک میں ٹیکنیکل اسٹاف اور انجینئرز کی کوئی کمی نہیں لیکن اس کے باوجود اس قومی ایئرلائن میں شاید ان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔جبکہ دوسری جانب حال یہ ہے کہ قومی ایئرلائن جو کہ مسلسل خسارے میں جارہی ہے وہ فیشن شو منعقد کروا رہی ہے جس کے لئے کروڑوں روپے کے فیشن ایبل ملبوسات (عملے کے لیے یونیفارم) تیار کروائے گئے۔اس صورتحال میں اگر اس کی نجکاری سے قوم کو فائدہ ہوتا ہے تو مسئلہ کیسے ہے۔

آج اگر پاکستان میں کسی قومی ادارے کی نجکاری کی بات کی جاتی ہے تو ایک طوفان برپا کرلیا جاتا ہے۔لیکن اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ وہ سرکاری یا غیر سرکاری ادارے جس میں بدعنوانی بڑھ جائے یا ان میں جدت اور بہتری نہ لائی جائے تو ان کا وجود برقرار نہیں رکھا جاسکتا اور وہ زیادہ دیر نہیں چل پاتے۔زندگی کے ہر شعبے میں بلاشبہ بہتری، جدت اور اعلیٰ و معیاری مشینری کے ساتھ ساتھ تجربہ کار ملازمین کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔اگر کوئی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ ترقی کرنے کے لیے جدید طریقے اختیار نہ کرے تو وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔جس وقت پاکستان سٹیل مل اور پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائن کی نجکاری کی بات کی گئی تو یہ بات سامنے آئی کہ ان دونوں سرکاری کمپنیوں کے خسارے کے پیچھے بے شمار عوامل کارفرما ہیں، جن میں کرپشن، سرکاری بھرتیاں، حکومت کی عدم توجہی وغیرہ شامل ہیں۔اگر ان اداروں کو نقصان پہنچانے والوں کا بروقت احتساب نہ کیا جائے تو بلاشبہ ایسے حالات پیدا ہوجائیں گے کہ ملک و قوم کے قیمتی اثاثے کوڑی کے داموں فروخت ہونے لگیں۔دوسری جانب پاکستان میں اینگرو فوڈز کی مثال لے لیں جو کہ ایک بہت بڑی اور کامیاب نجی کمپنی ہے۔حال ہی میں خبر آئی ہے کہ ایک ڈچ کمپنی اسکو مہنگے داموں خرید رہی ہے۔اور اگر یہ سودا طے ہوجاتا ہے تو یہ پاکستان کی اقتصادی تاریخ کا سب سے بڑا تجارتی سودا ہوگا۔اور اگر نجی کمپنیاں شفافیت سے کام نہ کریں تو اس کی مثال انڈیپنڈنٹ پاور پراجیکٹس (آئی پی پیز) جیسی ہوگی جو عوام کے اربوں روپے کھا چکی ہیں اور ابھی تک یہ کمپنیاں بجلی پیدا نہیں کرپائیں۔جائز منافع کمانا سب کا حق ہے، لیکن اگر جس مقصد اور سہولت کے لیے کمپنیاں یا ادارے بنائے جاتے ہیں، وہ مقاصد ہی نہ پورے ہو رہے ہوں تو چاہے وہ سرکاری ادارے ہیں یا غیر سرکاری ان کا احتساب لازمی ہے۔اگر اداروں کی نجکاری سے عوام کے بیروزگار ہونے کا خطرہ ہے تو پھر ملازمین اس بات کو یقینی بنائیں کہ وہ عوام کے فائدے کے لیے اداروں کو مضبوط بنانے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کررہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

موسمیاتی تبدیلی

تحریر: ریحان علی

اختر زمین پر بیٹھا بارش کی آواز کو سن رہا تھا۔ مون سون کی بارشیں ہر سال آتی ہیں جن کی آمد تیز ہواؤں کے ساتھ ہوتی ہیں اور جس کے بعد آنے والے گھنے سیاہ بادل پہاڑوں، جنگلات اور آبادیوں پر موسلا دھار بارش برساتے ہیں۔ اس سال چیزیں مختلف تھیں۔ بہت دیر سے تیز بارش ہو رہی تھی۔ اسی دوران بزرگوں نے بڑبڑایا! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ان میں سے اکثر کو یاد تھا کہ پچھلی بار بھی بارشیں بہت دیر تک جاری رہیں تھیں اور وہ یہی بتاتے رہے تھے کے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن اس بار ان کے چہروں سے پریشانی عیاں تھی۔

تیز بارش کے باعث گاؤں کے کچھ گھر منہدم ہو چکے تھے۔ اختر نے بھی چند لمحوں بعد اپنے گھر کی چھت کی طرف دیکھا۔ اس گھر نے اختر کی حفاظت ایک ڈھال کی طرح کی تھی لیکن اس وقت وہ اس سوچ میں مگن تھا کہ اس بارش کے بعد یہ گھر اس کی حفاظت کے لائق بھی رہے گا یا نہیں۔ اختر انہی خیالوں میں گم تھا جب اس کو چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے باہر دیکھا تو اسے اپنا پڑوسی بدحواسی کی حالت میں بھاگتے ہوئے نظر آیا جو لوگوں سے چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اپنے گھر فوری طور پر خالی کریں۔ وہ کافی پریشان لگ رہا تھا۔ اختر کے والد جلدی سے اٹھے اور اپنے گھر والوں کو گھر سے باہر نکالا۔ آس پاس کے تمام علاقے سیلاب کی زد میں آ گئے تھے اور پانی ان کے علاقے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اختر کے والد زور زور سے پکار رہے تھے کہ انہیں یہاں سے جلدی نکلنا ہوگا۔ اختر وہ دن یاد کرتا ہے جب اس نے کمبل میں لپٹی ہوئی اپنی بہن کو کاندھے پر رکھا اور اسی تیز بارش میں پناہ گاہ کی طرف بھاگنے لگا۔ وہ ایک منٹ کے لئے رکا اور پیچھے مڑ کر دیکھا، پانی اس کے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ ایک لمحے میں ہی ان کی زندگی کی ساری کمائی سیلاب کی نظر ہو گئی۔ آنے والے چند دن بہت مشکل کے تھے۔ لوگ اپنے گھر والوں کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن موبائل فون بھی کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ بہت سے لوگ اپنے خاندان کے کسی عزیز یا دوست کو کھو بیٹھے تھے۔

کھلے آسمان کے نیچے رات گزارنے کے بعد اگلے دن آخر کار ایک فوجی ہیلی کاپٹر کھانے کے اشیاء لے کر اس علاقے میں نمودار ہوا۔ اس نے لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ قریب ہی لگائے گئے ایک کیمپ میں منتقل ہو جائیں۔ مگر اس کیمپ تک پہنچنے کے لئے انہیں ایک دن لگا۔ اختر اور اس کا خاندان کیمپ میں پہنچ گئے لیکن وہاں کی انتظامیہ نے ان کے ساتھ سخت رویہ اپنایا اور ان کو وہاں جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ انتظامیہ رشوت لے کر لوگوں کو اس کیمپ میں جگہ فراہم کر رہی تھی۔ اسی عمل کی پیروی کرتے ہوئے اسے کیمپ میں جگہ مل گئی۔ کیمپ میں لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جبکہ اس کے مقابلے میں کھانے پینے کی چیزیں میسر نہیں تھیں۔ کھانے کے اوپر لوگ آپس میں لڑ پڑتے۔ رات کے وقت ماؤں کی چیخنے کے آوازیں سنی جا سکتی تھیں جب وہ اپنے لاپتہ بچوں کو یاد کرتیں۔

موسمیاتی تبدیلی یا کلائمیٹ چینج ایک حقیقت ہے۔ یہ کوئی تھیوری نہیں ہے جسے ایک سائنسدان نے کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھ کر بنایا۔ یہ ایک طویل مدت پر محیط ایک کیفیت ہے، جس کا اشارہ ایک سے زیادہ مختلف شعبہ جات جیسے موسمیات، ارضیات، فارسٹری اور بحریات نے اپنے کئی تحقیقی مطالعہ جات میں کیا ہے۔ شدید موسم اور اس کے اثرات جیسا کہ ۲۰۱۰ء میں ہونے والی مون سون کی بارشیں اور ان کے نتیجے میں آنے والا سیلاب، موسمیاتی تبدیلی کے خوفناک پہلوؤں کو ظاہر کرتا ہے۔

اختر کی کہانی ان بے شمار کہانیوں میں سے ایک ہے جو موسمیاتی تبدیلی سے متاثر ہوئے ہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں موسمیاتی تبدیلی لوگوں کے روزمرہ کے معاملات میں مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ گزشتہ سال سردیوں میں اسلام آباد میں مارگلہ کی پہاڑیوں پر برف باری ہوئی۔ برف باری سے لوگ لطف اندوز تو ہوتے ہیں لیکن اسلام آباد کے شہریوں کو اس شدید سردی کے اثرات بھی برداشت کرنے ہوں گے۔ ایندھن کے اخراجات بڑھتے جائیں گے کیونکہ لوگوں کو اپنے گھر گرم رکھنے کے لیے ہیٹر کا زیادہ استعمال کرنا ہوگا۔ ملک میں توانائی کا بحران پہلے سے ہی موجود ہے، اس سردی کے بعد توانائی کے وسائل میں مزید قلت پیدا ہوگی۔ جو لوگ دارالحکومت کے مضافات میں اپنے معاش کے لئے کاشتکاری کرتے ہیں انہیں موسم سرما کی فصلیں اگانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

فرض کریں اگر پنجاب کو اسی قسم کے سخت ترین موسم کا سامنا کرنا پڑ جائے تو پنجاب کی فصلوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ صوبہ کی آبادی کی اکثریت کا معاشی دارومدار زرعی پیداوار پر ہے اور پاکستان کی برآمدات میں بھی اس کا بڑا حصہ بنتا ہے جو ملک کے جی ڈی پی کا ۲۱ فیصد ہے۔ تیز بارشیں، خشک سالی یا سیلاب، یہ سب مسائل جو آب وہوا کی تبدیلی سے منسلک ہیں پورے صوبے میں غذائی عدم تحفظ پیدا کر سکتے ہیں۔

دنیا میں موسمیاتی تبدیلی سے نمٹنے کے لئے کوئی خاص توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں جو چند اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جو ممالک کلائمیٹ چینج کے ذمہ دار ہیں وہ بہرحال اس جانب زیادہ توجہ دیں گے ان ممالک کے مقابلہ میں جو کلائمیٹ چینج کے نہ تو ذمہ دار ہیں اور نہ ہی اس طرف توجہ دے رہے ہیں۔ مثلاً کیا گھانا کو چین جتنا ہی ذمہ دار ٹھہرانا چاہیے حالانکہ اس کے پاس صنعتی بنیاد ہی نہیں جب کہ چین کاربن ڈائی آکسائیڈ کے میٹرک ٹن روزانہ استعمال کرتا ہے۔ دنیا کو آب وہوا کی تبدیلی کے مہلکہ اثرات سے بچنے کے لئے سخت اقدامات اٹھانے ہونگے۔

پیرس میں اسی سال ایک کلائمیٹ چینج کانفرنس منعقد کی گئی جس میں تمام ممالک دنیا میں موسمیاتی تبدیلی سے نمٹنے کے لئے متفق تھے۔ ان ممالک نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ہر ایک ملک کاربن کے اخراج میں کمی لائے گا۔ کانفرنس میں شریک ممالک نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ممالک میں کاربن کے اخراج میں کمی لانے اور کلائمیٹ چینج کے اثرات کا مقابلہ کرنے میں ان کی مدد کریں گے۔

موسمیاتی تبدیلی کے اثرات سے بہت زیادہ متاثر ہونے کی وجہ سے پاکستان کو اس جانب ضرور توجہ دینی چاہئے۔ ہمیں اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ اس ملک میں بار بار گرمی کی لہر کا آنا، سیلاب، خشک سالی اور آئے روز سالانہ بارشوں میں کمی کی وجہ سے انسانی زندگی زیادہ خطرے میں ہے، جنگ اور بم دھماکوں کے مقابلے میں۔ ۲۰۱۰ء کا بدترین سیلاب ہمارے سامنے ہے جس میں بیس ملین لوگ متاثر ہوئے۔ فی الحال تو لوگ اس مسئلے کے بارے میں اتنے آگاہ نہیں ہیں مگر حکومت کا اس طرف توجہ نہ دینا مایوس کن ہے۔ کسی بھی حکومت نے اس جانب توجہ نہیں دی۔

موجودہ حکومت کلائمیٹ چینج کے مسئلہ کو سنجیدگی سے لے۔ صرف قومی پالیسیاں بنانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا جب تک کہ ان پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔ ووٹ حاصل کرنے کے لئے موٹروے اور میٹرو جیسے پراجیکٹس پر توجہ دینے سے زیادہ توانائی کے منصوبے پر پیسہ لگانے کی ضرورت ہے۔ کوئلے سے چلنے والے بجلی گھروں کے بجائے حکومت کو شمسی، ہائیڈل اور ونڈ توانائی کی طرف توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ شمسی توانائی کے بارے میں اگر بات کریں تو موجودہ حکومت بجلی کے بحران سے نمٹنے کے لیے بہاولپور میں ایک سولر پارک بنا رہی ہے لیکن یہ سولر پارک وائلڈ لائف پارک کی جگہ پر تعمیر کیا جا رہا ہے جس کے لئے ایک بڑی تعداد میں درخت کاٹے گئے ہیں جس سے ماحول متاثر ہوگا۔ یہی سولر پینل بنجر زمین پر لگایا جا سکتا تھا تاکہ درخت کاٹنے کی نوبت نہ آتی۔ جنگلات کی کٹائی پر بھی پابندی لگانی چاہیے کیونکہ درخت سیلاب میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں ہے۔ حکومت کو زیادہ پیسہ درختوں اور پودوں کے لگانے پر خرچ کرنا چاہئے۔

پوری دنیا اس وقت عالمی درجہ حرارت میں اضافے کو ہر سال دو ڈگری سینٹی گریڈ تک محدود کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور ساتھ ساتھ گلوبل حرارت سے بھی نمٹنے پر توجہ دے رہی ہے۔ توانائی کے حصول کے لئے صرف ہائیڈل اور ونڈ انرجی کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ لیکن دوسری طرف پاکستان کوئلے سے چلنے والے بجلی گھروں کی تعمیر پر توجہ دے رہا ہے۔ اگر حکومت موسمیاتی تبدیلی کو سنجیدگی سے نہیں لیتی اور اس سے نمٹنے کے لیے اقدامات نہیں اٹھاتی تو یہ مسئلہ روز بروز بڑھتا جائے گا جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔ پاکستان جو موسمیاتی اور ماحولیاتی تبدیلی کے خطرے سے دوچار ہے اب مزید تاخیر کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ قومی معیشت کو مضبوط بنانے کے لئے قومی موسمیاتی تبدیلی کی پالیسی کو ملک کی معاشی پالیسی کے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

مذہبی اقلیتیں اور ہمارا معاشرہ

تحریر: الہام کاکڑ

کچھ دن پہلے سوشل میڈیا پر ایک مسلمان لڑکے کی کہانی بار بار شئیر کی جا رہی تھی۔ تحریر کردہ کہانی کے مطابق اس لڑکے نے اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ مل کر ایک مندر میں ان کے مذہبی تہوار 'ہولی' کو بہت خوشی اور جوش و خروش سے منایا۔ تقریب کے بعد اس نے اپنے اس عمل کے بارے میں عام لوگوں کا ردِعمل جاننے اور پاکستان میں مذاہب کے تنوع کے بارے میں لوگوں کے تاثرات جاننے کے لئے اپنے کپڑوں اور چہرے پر ہولی کے رنگ لیے پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کیا۔ اس سفر کے دوران اس کے سامنے معاشرے کے دو پہلو آشکار ہوئے۔ وہ لڑکا کہانی میں بیان کرتا ہے کہ ایک بزرگ شخص کا یہ کہنا تھا کہ ہندو اور مسلمان کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے اور اسی بنیاد پر ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ جس پر اس بزرگ کو ایک اور مسافر نے ٹوکا اور جواب دیا کہ اگر ہولی کے رنگ ہمارے ملک میں رہنے والے مختلف مذاہب کے بچوں کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ دے رہے ہیں تو ہمیں اس طرح کے اقدامات کو مذہب سے بالاتر ہو کر سراہنا چاہئے۔

اس کہانی میں مثبت اور منفی پہلو دونوں موجود ہیں۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں غیر مسلم اقلیتوں کو ایک پاکستانی کی حیثیت سے تسلیم کروانے کی خواہش ابھی تک زندہ ہے۔ دوسرا پہلو جو افسوس ناک ہے وہ یہ کہ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو پاکستان میں بسنے والی غیر مسلم اقلیت کے لئے نفرت کے جذبات رکھتے ہیں۔ سکول کی کتاب میں ہم بچپن سے پڑھتے چلے آئے ہیں کہ ہمارے قومی پرچم میں سفید رنگ اقلیتوں کو ظاہر کرتا ہے اور پاکستان کا آئین ان کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ مگر کیا ہم بطور شہری ان کو تسلیم کرتے ہیں؟

پاکستان کے قیام سے پہلے موجودہ پاکستان کی سرزمین پر ایک سے زیادہ مذاہب کے ماننے والے آباد رہے ہیں اور ابھی بھی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ تاریخ پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس خطے کے کئی علاقوں میں مختلف مذاہب کے لوگ ایک کمیونٹی کی طرح رہتے تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ مذہبی بنیادوں پر الگ ہوتے گئے اور اپنی علیحدہ علیحدہ کمیونٹیز بنا لیں۔ اس دوری کے سبب مختلف مذاہب کے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت، رواداری اور برداشت کم ہوتی گئی۔

پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کے حوالے سے واقعات اور بیانات سامنے آتے رہتے ہیں مگر ابھی صورتحال اتنی خراب نہیں ہوئی۔ حکومت اور ریاست کے اداروں کی جانب سے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اٹھائے گئے اقدامات اور اس حوالے سے ان کے بیانات بھی حوصلہ افزاء اور خوشی کا باعث بنتے ہیں۔ یقیناً حکومت کی جانب سے اٹھائے گئے اقدامات قابل ستائش ہیں اور ریاست انہیں برابر کا شہری تصور کرتی ہے۔ لیکن حکومت اقلیتوں کو ریاست کی جانب سے فراہم کردہ حقوق کی فراہمی کو یقینی بنائے تاکہ وہ بھی خود کو اس معاشرے کا حصہ سمجھیں۔

حال ہی میں وفاقی اور صوبائی حکومتوں نے مذہبی اقلیتوں کے لئے متعدد مثبت اقدامات اٹھائے ہیں۔ پنجاب حکومت کی جانب سے سرکاری نوکریوں میں اقلیتوں کے لئے الگ کوٹہ مختص کیا گیا۔ سپریم کورٹ کے حکم پر خیبر پختونخواہ کے ضلع کرک میں حکومت کی جانب سے ہندو مندر کی از سرِ نو تعمیر کی جا رہی ہے۔ خیبر پختونخواہ میں ہی گردوارہ بھائی بیبا سنگھ کو دوبارہ سے مرمت کیا گیا جس کے بعد وہاں چھ دہائیوں کے بعد پہلی مرتبہ بھجن کی آواز گونجی۔ اس بار سندھ حکومت نے ہندوؤں کے تہوار 'ہولی' کو سرکاری طور پر منانے کا اعلان کیا اور سندھ میں پہلی بار ہندوں کے اس مذہبی تہوار کے موقع پر سرکاری تعطیل کا اعلان کیا گیا۔ اس سلسلے میں حکومت ہر سطح پر اقدامات کر رہی ہے لیکن کیا ہمارے معاشرے میں غیر مذہبی اقلیتیں محفوظ ہیں؟

چند ایسے واقعات سامنے آئے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اقلیتی برادری اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی ہے۔ غیر مسلم اقلیتوں کی عبادت گاہوں کو نشانہ بنایا گیا۔ یہ اقلیتیں نہ صرف دہشتگردوں کا ہدف بنتی ہیں بلکہ انہیں معاشرے میں مسلمان اکثریتی طبقہ کے انتہا پسندوں کی جانب سے بھی کھلے عام نشانہ بنایا جاتا ہے۔ حکومت کی جانب سے ایسے عناصر کے خلاف بروقت کاروائی نہ کرنے کی وجہ سے ان لوگوں کو ظلم کرنے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ اسی لئے جب ریاستی پالیسیوں کے نفاذ کی بات کی جاتی ہے تو مسلمان

اور دیگر اقلیتوں میں فرق برتنے کی باتیں سامنے آتی ہے۔ ماضی کے واقعات کی روشنی میں اقلیتوں کے حق میں ہمیں اپنے رویوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک مہذب معاشرے کا ثبوت دیتے ہوئے ہمیں ایک فرض کے طور پر اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہئے۔

بحیثیت شہری انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو کسی دوسرے پاکستانی کو حاصل ہیں۔ وہ اپنے تہوار اسی جوش و خروش کے ساتھ منا سکتے ہیں جیسا کہ مسلمان مناتے ہیں۔ اگر اقلیتی برادری کا کوئی شخص حکومت میں کسی اہم شعبے میں ہے یا اعلیٰ عہدے تک پہنچ جاتا ہے تو یہ کوئی اہم خبر نہیں ہونی چاہیے کیونکہ آئین اور قانون کے مطابق یہ اس کا حق ہے اور ریاست اس پر کوئی احسان نہیں کر رہی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ایک قوم کی حیثیت سے متحد ہوں اور ہر سطح پر مذہب، نسل، عقیدے یا زبان کی بنیاد پر تفریق اور تعصب کی مخالفت کریں۔ پاکستان میں بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لئے حکومت اور معاشرے کے افراد کو مل کر کوشش کرنا ہوگی۔ ایک دوسرے کے تقاریب میں شامل ہونے سے آپس میں پائی جانے والی نفرتیں کافی حد تک کم ہو سکتی ہیں۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

تیسری صِنف کی مشکلات

تحریر: حور کاکڑ

پاکستان میں عوام کئی اعتبار سے امتیازی سلوک کا شکار ہوتے ہیں، اس کی بنیاد مذہب، فرقہ، رنگ و نسل، زبان یا جنس کوئی بھی ہوسکتی ہے۔ جنس کی بنیاد پر کیے جانے والے امتیازی سلوک کے خلاف حقوقِ نسواں کے نام سے آواز بلند کی جاتی ہے۔ اسی تحریک کے نتیجے میں اس وقت ہمارے معاشرے میں عورتوں کے حقوق کے حوالے سے کافی آگاہی پیدا ہو چکی ہے۔ عورتوں کے لئے مساوی حقوق اور ان کے لئے روزگار کے مواقع کی فراہمی کے مطالبات کے درمیان ہم نے تیسری صِنف کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، جو کہ پاکستان کی مخنث برادری ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اس برادری سے ہمدردی کرنے والے بہت کم ملتے ہیں کیونکہ ہم ان افراد کو اپنے سے بالکل الگ تھلگ سمجھتے ہیں اور ان سے میل جول رکھنا گوارا نہیں کرتے، نتیجتاً وہ خاموشی سے معاشرے کے ہر طرح کے رویے کو برداشت کرتے ہیں۔ اس صنف سے حقارت آمیز رویہ رکھنا کیا انسانیت کی تذلیل نہیں؟ کیا ہم معاشرے میں پائے جانے والے تنوع کو قبول کرنے اور تیسری جنس کو معاشرے کا حصہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں؟

یہ بات تو ہم بخوبی جانتے ہیں کہ دنیا میں تیسری صنف کا وجود ہے لیکن ہم انہیں قبول نہیں کرتے۔ انہیں ان کے حقوق نہیں دیے جاتے۔ انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے مستقبل کا انتخاب کر سکیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم نے انہیں انسان سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ ۲۰۱۲ء میں پاکستان میں پہلی بار تیسری جنس کو شناختی کارڈ جاری کئے گئے اور انہیں ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہوا۔ قیامِ پاکستان کے ۶۰ سال بعد حکومت کے اس اقدام سے مخنث برادری بہت خوش تھی کہ بالآخران کو قبول کر لیا گیا ہے اور ان کے حق میں حکومت کی جانب سے کچھ اچھے اقدامات بھی کئے جا رہے ہیں۔ لیکن کیا ان اقدامات سے انہیں معاشرے میں انصاف حاصل ہوا؟ مردم شماری میں ابھی تک ان کو شمار کرنے کے لئے کوئی کوشش سامنے نہیں آئی، اسی طرح معذور افراد کی فہرست میں بھی ان کا شمار نہیں ہوسکا کیونکہ وہاں بھی جنس کے دو ہی کالم تھے، ایک عورت کے لیے اور ایک مرد کے لیے۔

۲۰۱۵ء میں ایک بچے کو چارسدہ کے ایک سکول سے نکال دیا گیا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اسے ایک مخنث نے گود لیا ہوا تھا۔ اس برادری کو پاکستان میں عدم برداشت کا سامنا ہے یہاں تک کہ انہیں بنیادی حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔ تعلیم اور صحت کی فراہمی تو دور کی بات ان سے ان کی بنیادی سہولت 'چھت' بھی چھینی جا رہی ہے۔ حال ہی میں نوشہرہ میں ایک ایس ایچ او نے وہاں رہنے والی مخنث برادری کو علاقہ خالی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی بھی وجہ ہو لیکن اس سے پہلے قانونی کاروائی کا ہونا ضروری ہے اور پھر اس کے بعد عدالت کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہئے۔ محض شک کی بنیاد پر ان کو بنیادی حق سے محروم کرنا کسی طور درست نہیں۔

کیا پاکستان وہ واحد ملک ہے جہاں پر شہریوں کے آئینی حقوق مخنث پر لاگو نہیں ہوتے؟ دستاویزات کے مطابق مخنث برادری کے لیے نوکریوں میں دو فیصد کوٹہ مقرر کیا گیا ہے، جبکہ عملی طور پر بالکل صفر ہے۔ ان کے لئے پیشے بھی محدود ہیں۔ ان کے بارے میں دقیانوسی تصورات یہ ہیں کہ وہ صرف سڑکوں پر رہتے ہیں، بھیک مانگتے ہیں، رقص کرتے ہیں۔ دوکان چلانا، یا کسی ہوٹل میں ویٹر کی نوکری کرنا اور یا دیگر نوکریوں میں جگہ بنانا ان کے لئے بس ایک خواب ہے۔

پاکستان میں ہم نے اس برادری کو معاشرتی اور اداراتی دونوں سطحوں پر الگ کر دیا ہے۔ ان کے خلاف امتیازی سلوک کا یہ حال ہے کہ اگر وہ اپنے کسی مسئلہ کے حل کے لئے احتجاج بھی بلند کرتے ہیں تو ان کی آواز کو کوئی نہیں سنتا۔ افسوسناک صورتحال تو یہ ہے کہ جب پشاور میں ایک مخنث کو گولی لگی تو ہسپتال کا عملہ تین گھنٹے تک اس کا علاج کرنے سے ہچکچاہٹ محسوس کرتا رہا۔ معاشرے کے ان رویوں کی اہم وجہ وہ دقیانوسی تصورات ہیں جو ہم نے اس تیسری جنس سے منسلک کر دیے ہیں۔ ہم انہیں عام افراد کی طرح نہیں سمجھتے بلکہ جسمانی طور پر پائی جانے والی کمی کو دیکھتے ہیں۔

عام اصطلاح میں ان کے لئے خواجہ سراء کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ ان کو دیگر غیر مہذب ناموں جیسے ہیجڑا یا کھسرا کہہ کر بھی پکارا جاتا ہے۔ معاشرے میں ان کی قبولیت کے لیے میڈیا اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ ان کے بارے میں پھیلے ہوئے دقیانوسی تصورات کو ختم کرنے اور معاشرے میں انہیں مقام دلانے کے لئے میڈیا کو مخنث کے مسائل کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ عام لوگ شاید یہی سمجھتے ہیں کہ مخنث بذات خود اس طریقہ زندگی کو اختیار کرتے ہیں، لیکن اگر ہم اس تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں اور ان سے جاننے کی کوشش کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ اس معاشرے سے کیا توقعات رکھتے ہیں۔

پاکستان میں جس طرح بچوں اور عورتوں کے حقوق کے لئے مختلف تنظیمیں سرگرم عمل ہیں، اس کے برعکس مخنث کے حقوق کے تحفظ کے لئے محض چند ایک لوگ کام کر رہے ہیں۔ پاکستان میں اخوت کے نام سے ایک ادارہ ہے جس نے اس جانب ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ یہ ادارہ مخنث کی رجسٹریشن کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں نہ صرف پیشہ ورآنہ تربیت فراہم کر رہا ہے بلکہ انہیں کاروبار کے لئے قرضے بھی مہیا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے لئے مختلف سرگرمیوں جیسا کہ کوئز، کھیلوں کے مقابلے اور پینٹنگ وغیرہ کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ ایک اور ادارہ 'موجز فاؤنڈیشن' کی جانب سے بھی مخنث کو قرضے دینے اور ان کو معاشرے میں کھویا ہوا وقار دلوانے کے لئے کچھ کاوشیں کی گئی ہیں۔

انہی کاوشوں کے نتیجے میں ہمارے درمیان تیسری صنف کے افراد کی کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں جو کامیابی سے اپنی زندگی گزار رہی ہیں۔

☆ ۶۰ سالہ آشی، جو اخوت نامی ادارے سے قرضہ لے کر کپڑے کا چھوٹا سا کاروبار چلا رہی ہے۔

☆ ۳۸ سالہ محمد عامر رضا، موجز نامی ادارے سے قرضہ لے کر کامیابی سے لنڈے کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ میک اپ کی دوکان بھی چلا رہا ہے۔

☆ ماسٹر تاج لاہور کے رہائشی ہیں اور بہترین درزیوں میں انکا شمار ہوتا ہے، انہوں نے نہ صرف خود یہ ہنر سیکھا بلکہ انڈسٹریل گارمنٹ سٹیچنگ کے نام سے پیشہ ورآنہ تربیت فراہم کرنے والے ادارے کی طرف دیگر مخنث برادری کے لوگوں کی بھی رہنمائی کی۔ انڈسٹریل گارمنٹ سٹیچنگ کی بدولت مخنث برادری کے ۲۴ افراد نے ہنر سیکھا، جن میں محمد نواز، الیاس، عاشی اور جیسمین بہترین شاگردوں میں سے ہیں۔

☆ ۲۰۱۴ء میں حکومتِ سندھ کی جانب سے تین خواجہ سراؤں کو (محکمہ سماجی بہبود میں) سرکاری نوکریاں دی گئیں، اور ان کے لئے تمام سرکاری نوکریوں میں ۲ فیصد کوٹہ بھی مقرر کیا گیا۔

☆ جولائی ۲۰۱۰ء میں سارہ گل نے جناح میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج کراچی میں داخلہ لیا، وہ پاکستان میں تعلیم حاصل کرنے والی پہلی مخنث ڈاکٹر کہلائی جائیں گی۔

☆ لٹریسی اینڈ نان فارمل بیسک ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ فاٹرانس جنڈر نے لاہور اور راولپنڈی میں مخنثوں کو بنیادی تعلیم اور پیشہ ورآنہ تعلیم دینے کا آغاز کیا ہے۔ ان میں اس وقت ۳۰ سٹوڈنٹس تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

اس معاشرے میں اپنی جگہ بنانے کے لئے بلاشبہ مخنث برادری کو حکومت کی جانب سے اٹھائے گئے اقدامات سے مستفید ہونا چاہئے۔ مخنث برادری سے کئے جانے والے بیشتر انٹرویوز میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ مخنث کو ان کے گرو اکثر جسم فروشی کی سرگرمیوں میں بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن اچھے اور برے لوگ ہر طبقہ میں موجود ہیں۔ ان میں سے ہی کئی اہم نام ان افراد کے بھی ہیں جو سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں سرگرم ہیں ۔افسوس کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی مخنث کسی امیر گھرانے میں پیدا ہوتا ہے تو اس کی زندگی عام گھرانے میں پیدا ہونے والے مخنث سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ کچھ خاندانوں میں ان کی پہچان چھپالی جاتی ہے اور ان کو کسی دوسرے ملک بھیج دیا جاتا ہے۔ جب کہ کچھ پاکستان میں رہتے ہوئے ہی بھی تعلیم بھی حاصل کر لیتے ہیں جن میں سے ایک نام سارہ کا ہے جو ڈاکٹر بننے جا رہی ہیں۔ وہ معاشرتی رویے جو ان کے بچوں کو ہمارے عام سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے سے روکتے ہیں ان میں تبدیلی لانے کی اشد ضرورت ہے۔

حوالہ جات:

http://www.dawn.com/news/1168641/the-invisibles-peshawars-transgender-pushed-to-societys-fringe

http://timesofindia.indiatimes.com/world/pakistan/Pakistan-to-soon-have-first-transgender-doctor/articleshow/6154972.cms

http://www.pakistantoday.com.pk/2016/02/27/entertainment/transgender-madrassa-closes-due-to-death-threats/

http://lendwithcare.blogspot.com/2014/08/more-than-just-microfinance-how.html

http://www.mojaz.org/jobs/Success%20Story%20of%20Transgender.pdf

http://www.navttc.org/SuccessStories.aspx

http://tribune.com.pk/story/665566/claim-your-rights-sindh-hires-three-transgender-people/

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

پاکستان سٹارٹ اپ:

اگر آپ پانی کے بغیر بجلی پیدا کرنے، جڑ کے بغیر درخت اُگانے اور بغیر آگ کے کھانا بنانے جیسے آئیڈیاز کاروباری سطح پر متعارف کروانا چاہتے ہیں یا آپ کے پاس کوئی نئے بزنس آئیڈیاز موجود ہیں تو دی انڈس انٹر پرینورز نے آپ کے لیے ایک پلیٹ فارم متعارف کروایا ہے جسے سٹارٹ اپ کا نام دیا گیا ہے۔ جسکے تحت مقامی سطح پر نئے کاروباری منصوبوں کی تخلیق کے لئے مقابلے منعقد کروائے جاتے ہیں۔ اس مقابلہ کی بدولت پورے پاکستان سے کاروبار میں دلچسپی رکھنے والے افراد نئے آئیڈیاز متعارف کرواتے ہیں جن میں سے بہترین ماڈل کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ منتخب افراد کو ورکشاپس کے ذریعے تربیت فراہم کی جاتی ہے، بلکہ بہترین بزنس ماڈل پر انعامات کا بھی اعلان کیا جاتا ہے۔ ایسی ورکشاپوں کے ذریعے نوجوانوں میں کاروبار کے جدید اور نئے آئیڈیاز ایک دوسرے سے شیئر کرنے اور ان پر عمل کرنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔

ویب سائٹ http://www.startup.pk

ای میل: contact@startup.pk

معذور افراد کی حوصلہ افزائی

عبدالباقی نے نویں کلاس کے امتحان میں شامل ہو کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ پیدائشی معذوری کو مجبوری بنانے کی بجائے ہمت اور حوصلے کے ساتھ اپنی دیگر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر زندگی کے میدان میں کیسے اپنے نام کے جھنڈے گاڑے جا سکتے ہیں۔ اس نوجوان، جو کہ نہ بیٹھ سکتا ہے اور نہ ہی چل سکتا ہے، کی محنت، لگن اور حوصلے کو سراہنے کے لیے سندھ کے وزیرِ تعلیم اور کراچی تعلیمی بورڈ کے سربراہ نے فوراً اس امتحانی مرکز کا دورہ کیا جہاں وہ امتحان دے رہا تھا، نہ صرف اس سے ملاقات کی بلکہ امتحانی مرکز میں اسے خصوصی میز فراہم کیا گیا جس پر اس نے لیٹ کر پیپر دیا۔ اس کی لگن اور حوصلے کو سراہا گیا اور اسے دس ہزار روپے کا کیش انعام دیا گیا۔ ہمیں ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو خود کو کسی سے بھی کمتر نہ گردانیں اور زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کی لگن میں جتے رہیں۔

بک ریویو: " کنسسٹینٹ پارلیمنٹری کورڈ: فنڈامنٹل رائیٹس آف دی سٹیزنز آف پاکستان "، ظفراللہ خان

تحریر: سندس سیدہ

ظفراللہ خان کی لکھی گئی کتاب " کنسسٹینٹ پارلیمنٹری کورڈ فنڈامنٹل رائیٹس آف دی سٹیزنز آف پاکستان " مارچ ۲۰۱۶ء میں سینیٹ آف پاکستان کی جانب سے شائع کی گئی ہے جو کہ ۶ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب پاکستان میں آئین کے بننے ،نافذ ہونے اور ٹوٹنے بکھرنے کے حوالے سے پڑھنے والوں کے ذہنوں پر نئے باب آشکار کرتا چلا جاتا ہے۔

پہلے باب میں بانیِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بارے میں انسانی حقوق کے وکیل کے طور پر پڑھتے اور جانتے ہوئے ،ان کے انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے اٹھائے گئے اقدامات اور سفر کے بارے میں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان میں انسانی حقوق کی حفاظت بلا شبہ بہت ہی مضبوط ہاتھوں نے تھامی تھی ۔ پڑھنے والے کے ذہن میں پاکستان کی موجودہ صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے اس حوالے سے بے شمار سوالات اٹھتے ہیں کہ پاکستان کی بنیاد ڈالنے والے لیڈروں کی بے شمار کاوشوں کے باوجود پاکستان میں انسانی حقوق کی فراہمی کی افسوسناک صورتحال کیوں ہے؟

ان سوالات میں سے چند کے جوابات پڑھنے والوں پر دوسرے باب کا مطالعہ کرتے ہوئے آشکار ہوتے جاتے ہیں ۔جس میں اس حوالے سے بات کی گئی ہے کہ پاکستان کے آئین کے نفاذ کا انحصار پاکستان میں قائم ہونے والی حکومت پر ہے، اگر پاکستان کے قیام سے مارچ ۲۰۱۶ء تک کے دور پر نظر دوڑائی جائے تو تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہمارے ملک میں زیادہ تر حکومت یونیفارم والے صدور کی رہی ہے جس کی بدولت بہار کے موسم سے پہلے ہی خزاں کا موسم آجانا پھل پھول کھلنے کی نوبت ہی نہیں آنے دیتا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ پاکستان میں ۵ دفع آئین سازی کی کوششیں کی گئیں جن میں ۱۹۳۵ء ایکٹ، ۱۹۵۶ء کا آئین، ۱۹۶۲ء کا آئین، ۱۹۷۳ء کا آئین اور عبوری ،لیگل فریم ورک آرڈر، ایمرجنسی اعلانات وغیرہ ہیں لیکن ان کی پاکستان میں لاگو ہونے کی معیاد دیکھیں تو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی معیاد کل ۳۱۴۲ دن، ۱۹۵۶ء کے آئین کی معیاد ۹۲۸ دن، ۱۹۶۲ء کے آئین کی معیاد ۲۴۸۲ دن، ۱۹۷۳ء کے آئین کی معیاد ۳۰۷،۱۵ دن اور عبوری ،لیگل فریم ورک آرڈر، ایمرجنسی اعلانات وغیرہ کی کل معیاد ۲۹۴۴ دن رہی ہے۔اس میں پاکستان میں پیش کیے جانے والے بل، مقاصد، اور پہلی پارلیمانی کمیٹی کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ابھی تک ان لیڈروں کے دور کی بات ہو رہی ہے جن کی بدولت پاکستان وجود میں آیا جس میں بے شمار دیگر وجوہات میں ایک اہم وجہ انسانی حقوق کی پامالی ہی تو تھی جس نے ہمیں الگ وطن حاصل کرنے کے لیے بیدار کیا تھا۔

ہمارا ملک دنیا کے نقشے پر پہلا اسلامی جمہوری ملک ہونے کی حیثیت سے کب ابھرتا ہے۔ایک جمہوری ملک کی جمہور ہونے کے ناطے ہمارے پاس کیا اختیارات ہیں؟ ایک جمہوری ملک میں انسانی حقوق کو کتنا تحفظ حاصل ہوتا ہے؟ اس کا اندازہ پاکستان کے آئین میں انسانی حقوق کے بارے میں پڑھ کر ہوتا ہے جو کہ تیسرے باب میں بیان کیا گیا۔کس طرح سے یہ باب مطالعہ کرنے والوں کو پاکستان میں پہلے آئین کو گلے لگانے کے بعد جہاں ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کو ریپبلک آف پاکستان بننے کی خوشی بخشتا ہے وہیں ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو پاکستان میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد آئین کو محض ۹۲۸ دن سانسیں لے سکنے کی بری خبر بھی سناتا جاتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کے لیے کمیٹی نے کیا تجاویز پیش کی تھیں اور ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت کیا حقوق حاصل ہیں اس کا ایک موازنہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ابھی بوٹوں کی چاپ باقی ہے جو اس باب میں بیان کی گئی جہاں نہایت خوبصورت انداز میں ۱۹۶۲ء کے آئین ۷۴۲ دن میں بننے اور پھر اس کے تحویل ہونے کے ساتھ ساتھ اس آئین کے تحت کیا حقوق حاصل رہے ان کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔اور پھر کیسے اسی یونیفارم میں ملبوث ایک نئے شخص کی جانب سے ۱۹۶۲ء کے آئین کو رد کرتے ہوئے ۱۹۷۰ء میں لیگل فریم ورک آرڈر جاری کرنے کا اعلان ہوتا ہے جو کہ عبوری جمہوری ریاست میں ۱۹ انسانی حقوق کے بارے میں آگاہی فراہم کرتے ہوئے چوتھے باب کو پڑھنے کی بے تابی جگا جاتا ہے۔

PAKISTAN SENATE
House of the Federation

Consistent Parliamentary Cord.

FUNDAMENTAL RIGHTS

of the Citizens of Pakistan

Zafarullah Khan

Published by Senate of Pakistan

کتاب میں بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں تفصیلاً معلومات فراہم کی گئی ہے۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں انسانی حقوق کیا ہیں اس حوالے سے پڑھتے ہوئے اس میں کی جانے والی ترامیم کے بارے میں بھی آگاہی ملتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پانچویں باب میں انسانوں کو تحفظ فراہم کرنے والے حقوق کے تحفظ کے لیے بنائے جانے والے اداروں اور ان کے کردار کے بارے میں پالیمنٹ کی جانب سے عوام کو دیے گئے تحفے کے بارے میں اس تحفے پر ردِعمل کا ظہار پڑھنے والے کے چہرے سے عیاں ہوتا ہے اور چھٹے باب میں ۸۸ انسانی حقوق کے قوانین کی فہرست ملتی ہے جو کہ نوآبادیاتی دور سے لے کر ۲۰۱۵ء تک کی ہے جواب بھی پاکستان کے قانون کی کتاب میں درج ہیں۔

آئے دن انسانی حقوق کو تحفظ فراہم کرنے والے غیر سرکاری اداروں کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ قانون سازی کی اشد ضرورت ہے اس کتاب کے مطالعے سے آپکو معلوم ہوگا کہ ہمارے پاس آئین اور قوانین موجود ہیں، ضرورت ہے تو ان پر عمل درآمد کروانے کی اور قانون کی بالادستی کی اور حقوق کی خلاف ورزی کی صورت میں ہم عدلیہ کا دروازہ بھی کھٹکھٹا سکتے ہیں ایسی صورت میں ہمیں کسی ادارے کی ضرورت نہیں کہ وہ قانون سازی کرے کیونکہ قانون موجود ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اگر وہ حقوق جو قانون میں درج ہیں ان کی خلاف ورزی کی جارہی ہے تو اس کے بارے میں غیر سرکاری ادارے سوال ضرور اٹھائیں اور عوام کو ان کا حق دلوانے کے لیے سرکاری اداروں سے انصاف فراہم کرنے کے لیے جواب طلب کریں۔ مزید اس کتاب کے مطالعے سے آپکو معلوم ہوگا کہ پاکستان میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے کیا کیا اقدامات اٹھائے گئے ہیں، ہمارے کیا حقوق ہیں۔ کن اداروں سے ہم اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سوال کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں آئین لاگو رہنے کی معیاد کتنی رہی؟ کتنے آئین بنے؟ اور پھر پاکستان کے جمہوری ریاست بننے کے بعد بھی پاکستان میں انسانی حقوق کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے کی جانے والی تگ ودو میں کہاں کہاں اور کیا کیا مشکلات پیش آئیں؟ اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ آمریت کے دور سے کتنا نقصان اٹھانا پڑا لیکن جمہوری حکومتوں کے عہد میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر بھی گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

ایک کاوش!

رابن ہڈ آرمی

رابن ہڈ آرمی کے نام سے پاکستان اور انڈیا میں ان لوگوں تک کھانا پہنچایا جا رہا ہے جو ان دونوں ممالک میں کھانے کی قلت نہ ہونے کے باوجود بھوکے سونے پر مجبور ہیں، جو کسی بیماری سے نہیں بلکہ بھوک کا شکار ہو کر ابدی نیند سو جاتے ہیں۔ کھانے کی قلت نہ ہونے کے باوجود سے مراد ہے کہ ہمارے ہاں کھانا ضائع ہوتا ہے لیکن اس سے کسی کا پیٹ نہیں بھرنے کے بارے میں سوچا جاتا، کھانے کو ان مستحق افراد تک پہنچانے کے لیے رابن ہڈ آرمی مختلف ہوٹلوں سے زائد کھانا حاصل کر کے اسلام آباد، کراچی اور لاہور میں ان افراد تک پہنچانے کا کام کر رہا ہے۔

فیس بک پیج Robin Hood Army

ویب سائیٹ http://robinhoodarmy.com/

رابطے کا پتہ info@robinhoodarmy.com

تھالی

لوگوں کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ضرورت خوراک کی فراہمی کے ہی حوالے سے ایک اور کاوش کا آغاز تھالی کے نام سے بھی کیا گیا جس کا مقصد اسلام آباد اور راولپنڈی کے شہروں کے مستحق افراد تک کھانا پہنچانا تھا۔

رابطے کا نمبر 03425334817

پتہ: ۶۰ سی، سیٹیلائیٹ ٹاؤن، راولپنڈی پاکستان

ای میل info@thali.org.pk

ویب سائیٹ http://www.thali.org.pk/

مقامی حکومتیں اوران کی ذمہ داریاں

تحریر: مجتبیٰ راٹھوراور ذوالفقار حیدر

جب ہم مقامی حکومتوں کی موجودہ ترجیحات اورامور کوزیر بحث لاتے ہیں تو ہمارے خیال میں مقامی حکومتیں ان امور کے علاوہ عوام کے روزمرہ کے مسائل کے حل میں بھی اہم کردارادا کرسکتی ہیں۔ پاکستان کے دیہی علاقوں میں کسانوں اور مزدوروں کے مسائل ،خواتین اور اقلیتوں کے حقوق کا خیال رکھنا اوراس ضمن میں ان کی آواز کو پالیسی ساز اداروں تک پہچانا مقامی حکومت کی اولین ترجیح ہونی چاہئے۔ مقامی حکومتی نظام میں پسماندہ طبقات کی نمائندگی کومزید مؤثر بنایا جاسکتا ہے،مگراس کے لئے لوگوں میں حقوق وفرائض کے حوالے سے شعورکی آگاہی اوران کے مفادات کا تحفظ ان حکومتوں کی ترجیحات میں شامل ہونالازمی ہے۔

پاکستان میں ٹیکس کا نظام مرکزی ہونے کی وجہ سے خاطرخواہ نتائج نہیں دے رہا،اس لئے حکومت عوام سے بلاواسطہ (مختلف ذرائع سے) ٹیکس کی وصولی کو ہدف بناتی ہے اگر اسی نظام کو مقامی سطح پر مقامی حکومت کی نگرانی میں دے دیا جائے تو مزید وسائل پیدا کئے جاسکتے ہیں۔عوام کے مسائل حل نہ ہونے کی ایک اہم وجہ کرپشن اور بدعنوانی ہے جس نے ہمارے قومی اداروں کوتباہ کرکے رکھ دیا ہے۔تمام اداروں میں رشوت اورسفارش کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا،عوام کے فنڈز میں خوردبرد کی خبریں عام ہیں۔ مقامی حکومتیں چونکہ ایک معینہ مدت کے لئے آتی ہیں اوراس میں زیادہ تر عوامی نمائندے شامل ہوتے ہیں اس لئے وہ عوام کے فنڈز میں شفافیت اور چیک اینڈ بیلنس کا ایک معیار قائم کرسکتے ہیں۔مزید بہتری اُس وقت ممکن ہے جب یہ نمائندے علاقے کے عوام کی ترجیحات کے مطابق پالیسیاں بنائیں اور پھر مقامی حکومتیں عوام کی زیرنگرانی ان پر عملدرآمد کریں۔

مقامی حکومتوں کے اس نظام میں عوام کی شمولیت سے لوگوں کے مسائل ان کی دہلیز پر ہی حل کئے جاسکتے ہیں۔اگر مقامی حکومتیں اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے بخوبی آگاہ ہوں اوران کو صحیح طور پر انجام دیں تو نچلی سطح پر کارِسرکار انجام دینے میں وہ مرکزی حکومت کے صف اول کے دستے کا کردارادا کرسکتی ہیں،مگراس کے لئے مقامی حکومتوں کے منتخب نمائندوں کی تربیت اوراستعدادکار میں اضافہ کرنے کی اشدضرورت ہے۔

بلاشبہ عوام کی بہتری اورترقی مؤثر مقامی یا بلدیاتی حکومتوں کے قیام سے منسلک ہے۔ایک عام تاثر کے مطابق عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل مقامی حکومتیں عوام کی ضروریات اورترجیحات کی بہترین ترجمانی کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔علاوہ ازیں ریاست اورعوام کے درمیان حائل خلیج کو پر کرنے کے لئے یہ حکومتیں نمایاں کردارادا کرسکتی ہیں۔مقامی حکومتیں کسی بھی جمہوری نظام کی بنیاد تصورکی جاتی ہیں۔جمہوریت کا بنیادی تقاضا بھی یہی ہے کہ مقامی سطح پر مسائل کے بہترحل کیلئے تمام انتظامی معاملات کو مقامی حکومتوں کے حوالے کردیا جائے۔

انتظامی لحاظ سے پاکستان کو چارصوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے،ان کے علاوہ گلگت بلتستان، فاٹا اورآزاد جموں وکشمیر بھی ملک کا حصہ ہیں۔ان تمام صوبوں میں تقریباً ۱۳۸ کے قریب اضلاع موجود ہیں۔ پاکستان میں مقامی یا بلدیاتی حکومت کا تصور نیا تو نہیں مگراس نظام کو کبھی بھی تسلسل کے ساتھ چلنے نہیں دیا گیااور یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ پاکستان میں قائم ہونے والی زیادہ تر مقامی حکومتیں فوجی ادوار میں قائم کی گئیں۔یقیناً اس کی ایک اہم وجہ عوام کی حمایت حاصل کرنا ہوتا ہے۔

موجودہ حکومت شائد پہلی جمہوری حکومت ہے جو مقامی سطح کے انتخابات کروانے میں کامیاب ہوئی ہے۔البتہ اس سلسلے میں پیش رفت دکھانا صوبائی حکومتوں کا کام ہے۔ حال ہی میں چیف جسٹس آف پاکستان جناب انورظہیر جمالی نے ایک پٹیشن کی سماعت کے دوران اس خدشے کا اظہار کیا کہ مقامی حکومتی نمائندے قانون سازی کی غیر

موجودگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔جس کی وضاحت کے لئے انہوں نے وفاقی دارالحکومت، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے نمائندوں سے یہ سوال پوچھا کہ انتخابات ہونے کے باوجود ابھی تک عوامی نمائندوں کو اختیارات اور فنڈز کیوں نہیں منتقل کیے گئے؟ جس کے جواب میں انہیں بلوچستان حکومت کے نمائندے نے کہا کہ بلدیاتی حکومتوں کو اختیارات اور فنڈز کی منتقلی کا بل پچھلے چھ مہینے سے صوبائی اسمبلی میں منظوری کا منتظر ہے۔ پنجاب کے نمائندے کا کہنا تھا کہ میئر، ڈپٹی میئر، چیئرمین اور وائس چیئرمین کے انتخابات اس لئے منعقد نہیں کئے جا سکے کیونکہ پنجاب لوکل گورنمنٹ ایکٹ کو لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کیا جا چکا ہے۔خیبر پختونخواہ کے چیف سیکریٹری کا کہنا تھا کہ صوبے میں مقامی حکومت کی تین سطحیں ہیں جس میں ضلع، تحصیل اور گاؤں کی سطحوں پر کونسلز شامل ہیں جن کے انتظام کے لئے مقامی حکومت کمیشن وجود میں آ چکا ہے اور اختیارات اور فنڈز کی منتقلی بھی کی جا چکی ہے۔اس نظام میں کمشنر کا کوئی خاطر خواہ کردار نہیں ہے البتہ ڈپٹی کمشنر کو تکنیکی امداد کی غرض سے اس نظام کا حصہ بنایا گیا ہے۔جبکہ ترقیاتی اسکیموں کی منظوری ضلع ناظم کی ذمہ داری ہے۔ وفاقی دارالحکومت کے کمشنر کا کہنا تھا کہ ۳۳ نظامتوں کو میئرز کے حوالے کیا جائے گا جبکہ منتقلی کا عبوری وقت ۱۸۰ دن کا ہے۔

مقامی نظامِ حکومت جہاں عوام کی مشکلات کا بہتر طریقے سے ازالہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں وہیں یہ عوام کو اپنے صحیح نمائندے چننے کا موقع بھی فراہم کرتی ہیں۔اس کے علاوہ نوجوانوں کو یوتھ کونسلرز کی صورت میں آگے آنے کا موقع ملتا ہے جس سے اُن میں قیادت کرنے کی صلاحیتیں بہتر ہوتی ہیں اور عوام کو مستقبل کے رہنماء دستیاب ہوتے ہیں۔پنجاب لوکل گورنمنٹ ایکٹ کے مطابق کل ۴۲۴۵ یوتھ کونسلرز مختلف سطحوں پر مقامی حکومتی نظام کا حصہ بنیں ہیں۔اس طرح یہ نوجوان یونین اور ڈسٹرکٹ کونسلز، میٹروپولیٹن و میونسپل کارپوریشنز اور میونسپل کمیٹیوں کی سطح پر فیصلہ سازی میں اپنا اپنا حصہ ڈالیں گے۔یہی نظام دیگر صوبوں میں بھی اسی طرح نافذ العمل ہوگا۔

پنجاب میں آنے والی مقامی حکومتوں کے لئے بے شمار چیلنجز موجود ہیں جن میں لوگوں کے بنیادی مسائل، تعلیم، صحت، صاف پانی کی فراہمی، صفائی کا نظام، ایمرجنسی سروسز اور انفراسٹرکچر کی تعمیر شامل ہے۔صوبائی حکومت نے اگرچہ ضلعی سطح پر کئی منصوبے شروع کئے ہیں مگر عوام کی ترجیحات اور ضروریات کو مقدم رکھتے ہوئے مقامی حکومتوں کو فعال کرنا لازمی ہے۔خیبر پختونخواہ میں جب بلدیاتی انتخابات کروائے گئے تو سات سات بیلٹ پیپر دیے گئے جس کی وجہ سے ووٹر پریشان تھے کہ کس پیپر پر کون سا نشان منتخب کریں۔اس عمل کو آسان بنانے کے لیے لوکل گورنمنٹ آرڈیننس میں ترامیم کی جا رہی ہیں اور ان ترامیم کے تحت کنٹونمنٹ بورڈ میں انتخابات ہو چکے ہیں۔جس کے تحت عوام چیئرمین، نائب چیئرمین اور جنرل کونسلر کو منتخب کریں گے جبکہ عوام کے یہ منتخب نمائندے اقلیتوں، خواتین، نوجوانوں اور مزدوروں کی مخصوص نشستوں پر اپنے ووٹ کے ذریعے نمائندے منتخب کریں گے۔صوبہ سندھ کے بڑے شہروں کراچی اور حیدرآباد میں مقامی حکومتوں کے انتخابات کے بعد مقامی حکومتیں ابھی قائم نہیں ہو سکیں۔ماضی کی مقامی حکومتوں کی کارکردگی کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئی حکومتیں بھی عوام کے معیار پر پورا اتریں گی۔صوبہ سندھ کے دیگر علاقوں میں مقامی حکومتوں کی قیام اور کارکردگی یقیناً ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب دینا صوبائی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

مقامی حکومتوں کے قیام اور بہتر کارکردگی کے ذریعے صوبائی حکومتیں عوام کو بااختیار بنا سکتی ہیں۔نچلی سطح پر اختیارات بانٹنے سے صوبائی حکومتیں اپنے فرائض کی ادائیگی بہتر طریقے سے کر پائیں گی اور انتظامی معاملات میں یقیناً بہتری واقع ہوگی۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

بے گھر افراد گھر کیوں نہیں جانا چاہتے؟

تحریر: عدنان بابر

پاکستان میں جب بھی دہشتگردی کی بات ہوتی ہے اس میں پاکستان کے قبائلی علاقوں (فاٹا) کا تذکرہ لازمی ہے۔ میری پاکستان کے ان علاقوں سے خاص انسیت ہے کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان میں جب بھی دہشتگردی کا کوئی واقع پیش آتا ہے تو اس کا سِرا فاٹا کے علاقوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ پچھلے دس سالوں سے پورے ملک میں امن وامان کی صورتحال خراب ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ کے نتیجے میں وفاق کے زیرانتظام ان قبائلی علاقوں کے حالات اس قدر خراب ہو چکے ہیں کہ وہاں کی زیادہ تر آبادی نقل مکانی کر کے دوسرے شہروں میں پناہ لینے پر مجبور ہے۔ فاٹا کے حالات اس قدر کیوں خراب ہوئے؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

مجھے اپنی پاک سرزمین کا چپہ چپہ عزیز ہے اور میں اپنے ملک کو شاداب و آباد دیکھنا چاہتا ہوں، مگر فاٹا کے حالات دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ علاقہ سرے سے پاکستان کا حصہ ہی نہیں۔ یہاں پر عوام کو جو سہولیات میسر ہیں وہ پاکستان کے کسی بھی دوسرے علاقے سے انتہائی کم ہیں اور جو ترقیاتی کام ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں وہ بھی عارضی نوعیت کے ہیں۔ حکومت اگر صحیح معنوں میں قبائلی علاقہ جات کی عوام کی محرومیوں کا ازالہ چاہتی ہے تو سب سے پہلے یہاں ایسے پروگرام متعارف کروائے جائیں جو مستقل بنیادوں پر ہوں۔ یہاں کے رہنے والوں کے پاس بھی وہ اختیارات، توانین اور زندگی کی آسائشیں ہونی چاہیں جو کہ پاکستان کے دیگر شہریوں کو حاصل ہیں۔

آس وقت تک جو فاٹا ڈویلپمنٹ اتھارٹی کی کارکردگی ہے، اس کا جائزہ لینے کے لئے اگر اس ادارے کے ترقیاتی منصوبوں پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارے نے اب تک کل ’۴۳۲۷۲‘ نوجوانوں کو مختلف فنون میں تربیت فراہم کی ہے، جبکہ تربیت حاصل کرنے والوں میں خواتین اور مرد دونوں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فاٹا ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے ماضی قریب میں پانچ چھوٹے ڈیموں کی تعمیر بھی کی ہے جن میں جنوبی وزیرستان ایجنسی میں واقع درگئی پل ڈیم، شمالی وزیرستان ایجنسی میں واقع ڈانڈی ڈیم، خیبر ایجنسی میں واقع زاوٗ ڈیم، مہمند ایجنسی میں واقع موٹو شاہ ڈیم اور ایف آر ٹانک میں واقع شین کچ ڈیم شامل ہیں۔ اس کے علاوہ باجوڑ ایجنسی میں واقع رغا گن ڈیم، مہمند ایجنسی میں واقع گنڈاوٗ ڈیم اور شمالی وزیرستان ایجنسی میں واقع کند ڈیم پر کام جاری ہے۔ اس کے علاوہ مزید ڈیموں کی تعمیر منظوری کے مراحل سے گزر رہی ہے۔

پاکستان کے سرحدی علاقہ ہونے کے اعتبار سے اس علاقے کی خاص اہمیت ہے۔ یہ علاقہ جو کئی ایجنسیوں پر مشتمل ہے جیسا کہ مہمند ایجنسی، باجوڑ ایجنسی، کرم ایجنسی اور خیبر ایجنسی وغیرہ، قبائلی طرزِ زندگی کا حامل ہے۔ شاید اس لئے پاکستان کے دوسرے علاقوں میں رہنے والے عوام اسے مختلف تصور کرتے ہیں۔ ہم میں سے کتنے لوگ ان قبائلی علاقوں سے واقف ہوں گے اور ان کی اہمیت کو جانتے ہیں؟ ان علاقوں کے بارے میں بات کرنے سے پہلی ہمیں ان علاقوں کے بارے میں تفصیل سے جاننے کی ضرورت ہے۔ قبائلی علاقے کے لوگوں کی پاکستان سے لازوال محبت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ یہاں پر بسنے والے لوگ نہایت غیور اور مہمان نواز ہیں۔ مگر دہشتگردوں کے خلاف آپریشن کی وجہ سے یہ مہمان نواز اور غیور قبائلی اپنا گھر بار، جائیداد اور اپنی سرزمین کو چھوڑ کر ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہیں۔ ان لوگوں کو ہم سب آئی ڈی پیز (ایسے افراد جن کو زبردستی اپنے گھروں سے بے دخل کر دیا گیا ہو) کا نام دیتے ہیں۔ دہشتگردی کے خلاف جنگ کے لیے انہوں نے اپنا گھر چھوڑا اور بے سروسامانی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ کبھی ہم نے یہ سوچا کہ اگر خدانا خواستہ کبھی ہم پر ایسا وقت آئے کہ ہمیں اپنا گھر بار چھوڑ کر بے سروسامانی کی زندگی گزارنی پڑے تو کیا ہوگا؟ جس طرح ہمیں اپنا علاقہ، پہچان اور اپنے خاندان عزیز ہیں اسی طرح قبائلی علاقوں کے رہنے والوں کو بھی اپنی مٹی سے اتنا ہی پیار ہے۔

عام طور پر ان قبائلی علاقے کے لوگوں کو ہماری سرحدوں کا محافظ کہا جاتا ہے لیکن اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری عوام پر عائد

ہوتی ہے؟ اگر ہاں تو پھر صرف قبائلی علاقوں کی عوام ہی کیوں محافظ ہے؟ دوسرے علاقوں میں رہنے والے اور دوسری سرحدوں کے قریب رہنے والے کیوں محافظ نہیں؟ یقیناً ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں قبائلی علاقے کے لوگوں کو بھی دوسرے شہریوں کی طرح سمجھنا چاہئے اور ان پر سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں ڈالنی چاہیے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ قبائلی علاقوں کی عوام ابتر زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ تعلیم کی کمی اور سہولیات کی عدم فراہمی ہے۔ آخر یہ سب کس کی ذمہ داری ہے؟ اس جانب توجہ کیوں نہیں دی جاتی؟ جس وقت اس علاقے میں دہشت گرد سر اٹھا رہے تھے اس وقت ان پر قابو کیوں نہیں پایا گیا؟ اس علاقے کو عسکریت پسند تنظیموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا، اور اس تمام صورتحال میں ہماری حکومتیں اور ادارے جان بوجھ کر غافل رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قبائلی لوگ محنت کش ہیں اور محنت کرنا جانتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں کام کرنے کے مواقع فراہم نہیں کیے جائیں گے تو وہ غلط راستہ اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بہتر سے بہتر مستقبل کے لئے انہیں مواقع فراہم کرنا ہوں گے۔ قبائلی علاقوں میں روزگار نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دیہاتوں سے شہر یا بیرونِ ملک منتقل ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے جب میرانشاہ وزیرستان میں آپریشن کے نتیجے میں وہاں سے لوگوں نے نقل مکانی کی تو صوبہ سندھ کی حکومت نے اعلان کیا کہ ہم اپنی سرحد سیل کرتے ہیں۔ سندھ میں اب کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی اور نہ ہی عوام نقل مکانی کرنے والوں کو پناہ دیں گے۔ صوبہ سندھ کا شہر کراچی جو ایک بڑا صنعتی مرکز ہے اور جہاں پورے ملک سے لوگ آ کر آباد ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ پابندی صرف قبائلی علاقے کے لوگوں کے لیے کیوں ہے؟ پورے پاکستان میں لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے تھے مگر صوبائی تعصب کی بنیاد پر اب صرف چند علاقے ہیں جہاں اس بات کی گنجائش باقی ہے کہ وہاں دوسری زبان اور نسل کے لوگ با آسانی رہ سکیں۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس طرح کی سازش کیوں کی جا رہی ہے اور کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اس سازش کا حصہ بن رہے ہیں؟ آپس کے اختلافات کو ہوا دینے میں ہمارا کتنا کردار ہے؟ میڈیا کیا کردار ادا کر رہا ہے اور اسے کیا کردار ادا کرنا چاہئے؟ یہ ایک اہم نکتہ ہے جس پر مزید غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات:

http://fatada.gov.pk/skill-development-trainings/

http://fatada.gov.pk/small-dams-power-integrated-ongoing-and-completed-projects/

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

۲۳ مارچ کو ہی مارچ کیوں؟

تحریر: الہام کاکڑ

۲۳ مارچ کا دن پاکستان کی تاریخ میں نہایت اہم ہے، جسے ہم یوم قراردادِ پاکستان کے طور پر مناتے ہیں۔ اس دن عام تعطیل ہوتی ہے اور اسلام آباد میں ایک فوجی پریڈ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس پریڈ میں پاکستان کی تینوں بری، بحری اور فضائی افواج حصہ لیتی ہیں۔ جوہری ہتھیاروں سمیت جن کی نگرانی پاکستان فوج کی اسٹریٹیجک کمانڈ فورس کے ذمہ ہے، مختلف قسم کے جنگی ساز و سامان کی نمائش کی جاتی ہے۔ اس سال یوم پاکستان کی تقریب کا منظر قابل دید تھا۔ روایتی میزائل، ٹینک، جے ایف تھنڈر لڑاکا طیاروں کے مظاہرہ کے ساتھ ساتھ پہلی بار پاکستان کے پہلے ڈرون طیارے 'براق' کو بھی نمائش کے لئے پیش کیا گیا۔ اس موقع پر بچوں نے جوش و خروش سے ملی نغمے پڑھے۔ مختلف ٹیلی ویژن چینلز سے نشر کی جانے والی اس تقریب کو عوام اپنے گھروں میں بیٹھ کر براہ راست دیکھتے ہیں۔

یوم پاکستان کی یہ تقریب ہر سال اسی طرح منائی جاتی ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم میں سے کتنے لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ یوم قراردادِ پاکستان کیوں منایا جاتا ہے؟ اس دن ایک ایسے ملک پاکستان کا خواب پیش کیا گیا تھا جس میں عوام کو حقیقی معنوں میں آزادی اور خودمختاری حاصل ہوگی اور جس میں انہیں تمام بنیادی حقوق اور سہولیات فراہم کی جائیں گی۔ کیا آزادی حاصل کرنے کے بعد عوام کی حالت میں کوئی تبدیلی آئی؟ پاکستان کا پہلا آئین ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ کیا گیا جس میں پاکستان کی عوام کو تمام حقوق اور اختیارات دینے کا وعدہ کیا گیا۔ اس آئین کی وجہ سے ہمارا ملک پاکستان بھی جمہوری ریاستوں میں شمار ہونے لگا، مگر کچھ عرصہ بعد اسے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام دے دیا گیا۔ ہمارے آئین میں درج ہے کہ اس ریاست کے تمام تر اختیارات عوام کے پاس ہیں، یعنی عوام اس ملک کی بادشاہ ہے۔ پاکستان کی صورت میں عوام کو ایک خودمختار ریاست کا تحفہ ملا، جس ریاست نے اسے وہ تمام اختیارات دیے جو شہریوں کو مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق حاصل کرنے کا حق دیتے ہیں۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ شہریوں کے حقوق کے محافظ حکمران انہیں یہ حقوق دینے میں ناکام رہے ہیں، جبکہ بدقسمتی یہ بھی ہے کہ اکثر شہری اپنے حقوق سے ہی لاعلم ہیں۔ وہ حکمران جنہیں عوام اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے منتخب کرتے ہیں، وہی اس کی زندگی کو دشوار بنا رہے ہیں۔ پاکستان کی عوام کے لیے ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کا دن اس آزاد اور خودمختار ریاست کو ایک جمہوری ریاست میں تبدیل ہونے کا پیغام لے کر آیا تھا لیکن بعد میں اس ملک پر زیادہ عرصہ فوجی حکومتیں مسلط رہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم جمہوری ملک ہونے کا جشن بھی فوجی تہوار کے طور پر منانے لگے، بجائے اس کہ ہم اسے جمہوری دن کے طور پر مناتے اور جمہور کے اختیارات کی بات کی جاتی اور جمہور کے حقوق کی فراہمی کو یقینی بنایا جاتا۔

پاکستان میں بڑھتی ہوئی دہشتگردی کے پیش نظر گزشتہ سات سالوں سے یہ دن اس ملک کی عوام کے لیے محض ایک قومی تعطیل بن کر رہ گیا تھا۔ مگر پاکستان فوج کی جانب سے انسدادِ دہشتگردی کے آپریشن کے آغاز کے بعد عوام کی خود اعتمادی کو فروغ دینے کے لیے ایک بار پھر فوجی پریڈ منعقد کروانے آغاز ہوا۔ حیرت کی بات یہ ہے عوام کو بنیادی حقوق دینے کی بجائے ایک پریڈ کے ذریعے عوام کی خود اعتمادی کو کیسے فروغ دیا جا سکتا ہے۔

اس دن کو جس طریقے سے منایا جاتا ہے اور اس کے اثرات ملک کی جمہور پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ وہ عوام جسے آئین اس ملک کا بادشاہ کہتا ہے اپنی معمول کی زندگی گزارنے سے بھی محتاج ہو جاتی ہے۔ اہم شخصیات کو پروٹوکول دینے کے لئے عوام کو پریشان کرنا اور ٹریفک کا نظام درہم برہم کرنا ہمارے ملک میں ایک عام بات ہے۔ اس کے علاوہ اس علاقے کی سیکیورٹی کو یقینی بنانے کے لیے سڑکیں بلاک کر دی جاتی ہیں اور پھر موبائل اور انٹرنیٹ کے سگنل بھی بند کر دیے جاتے ہیں۔ اس دن چھٹی ہونے کی وجہ سے اگرچہ ان سڑکوں پر ٹریفک کا دباؤ کم ہوتا ہے لیکن پھر بھی جن لوگوں ان سڑکوں سے گزرنا ہوتا ہے ان کے لئے متبادل روٹ بنا دئے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ اپنے گھروں تک بھی آسانی سے عام راستوں پر سفر کرتے ہوئے نہیں پہنچ سکتے۔ یاد رہے پاکستان کی جمہور کے لئے یہ تکلیف صرف ایک دن کی نہیں ہے بلکہ جس دن ہم قومی تعطیل منا رہے ہوتے ہیں اس سے دو دن پہلے ہی متبادل راستے سے آنا اور جانا پڑتا ہے کیونکہ اس بڑے اہم تہوار کے لیے پریڈ کی ریہرسل چل رہی ہوتی ہے۔

ٹریفک کا نظام بحال رکھنے کے لئے حکومت کی جانب سے متبادل راستے تو متعین کر دیے جاتے ہیں اور پھر عوام کی راہنمائی کے لیے ٹریفک پولیس کی بھاری نفری کو بھی تعینات کیا جاتا ہے۔ لیکن ۲۰ سے ۲۳ مارچ تک موبائل اور انٹرنیٹ کی سروس بند رکھنے کا متبادل فراہم نہیں کیا جاتا۔ بلاشبہ یہ اقدامات حکومت کی جانب سے اس خاص تہوار پر کسی بھی افسوسناک واقعہ سے بچنے کے لئے کیے جاتے ہیں لیکن عوام کی پریشانی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جن کا دنیا سے اور خاص کر اپنوں سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے اور وہ کسی بھی ناگہانی صورتحال سے کسی کو باخبر کرنے سے رہ جاتے ہیں۔ عوام کو پیش آنے والی یہ تمام صورتحال بالکل ایسے ہی ہے جیسے بادشاہ سے تمام اختیارات چھین کر اسے چوکیدار بنا دیا جائے۔ کسی بھی ہنگامی صورتحال میں ایمبولینس بلانے یا کسی کو اطلاع فراہم کرنے سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اور اگر ہسپتال ایسے راستے پر واقع ہو جہاں اکثر وی آئی پی کے لئے روٹ لگا ہوتو ہے تو شاید مریض وہاں تک پہنچ بھی نہ پائے۔

ایسے مواقع پر عوام کو کسی بھی پریشانی سے بچانے کے لئے حکومت کو پلان بی بنانا چاہئے۔ صرف ایک سائن بورڈ لگا دینا جس پر لکھا ہو تکلیف کے لیے معذرت خواہ ہیں، عوام کی دشواریوں کو کم نہیں کرتا۔ ایسے موقع پر عام تعطیل کرنے سے اس دن کی تاریخی اہمیت اجاگر نہیں ہوتی۔ عام عوام کی نقل و حرکت محدود کر کے ایسی تقاریب کو کامیابی سے منعقد کروانے سے بھی عوام کو کیا حاصل ہوتا ہے۔ اس اہم تہوار پر فقط فوجی پریڈ منعقد کروانے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف عسکری ہتھیاروں کی نمائش کا دن ہے۔ جس کے ذریعے ہم یہ پیغام دے رہے ہوتے ہیں کہ ہم جوہری ہتھیاروں کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ ایک ایسا دن جو اس حوالے سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ ہم بطور قوم کیسے مل جل کر امن سے رہ سکتے ہیں ہم اسے اس انداز میں مناتے ہیں کہ عوام کے لئے وہ دن گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

نیشنل ایکشن پلان کا ایک جائزہ

تحریر: سندس سیدہ

ابھی دسمبر ۲۰۱۴ء میں آرمی پبلک اسکول کے حملے میں سینکڑوں معصوم بچوں اور اساتذہ کی موت کے زخم نہیں بھرے تھے کہ چارسدہ یونیورسٹی پر دہشتگردوں کے حملے اور پھر لاہور میں گلشن اقبال پارک میں دھماکے نے قوم کے زخم پھر تازہ کر دیے۔ نہ جانے کب تک ہمارے اس چمن کے پھولوں کو ہوا میں خوشبو اور رنگ بکھیرنے سے پہلے ہی مسخ کر دینے کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دہشتگردی کی مکمل روک تھام کے لئے کوئی مناسب اقدامات کیے جا رہے ہیں یا نہیں؟ جب بھی کوئی دہشتگردی کا افسوس ناک سانحہ پیش آتا ہے تو ہمیں حکومت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس حوالے سے ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا پر بے شمار تبصرے اور خبریں گردش کرنے لگتی ہیں۔ انہی خبروں میں سے ایک نیشنل ایکشن پلان کی کارکردگی کے حوالے سے اٹھائے گئے نکات بھی ہیں جسے دہشتگردی سے نمٹنے کے لیے متفقہ طور پر تشکیل دیا گیا تھا۔ حکومت کی جانب سے مسلسل یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ نیشنل ایکشن پلان پر عمل درآمد کے حوالے سے مختلف آراء سامنے آتی رہتی ہیں جیسے کچھ لوگوں کے نزدیک اس پر سست رفتاری سے عمل ہو رہا ہے اور کچھ کے خیال میں بھرپور عمل ہو رہا ہے۔ کبھی دہشت گردوں کے خلاف کاروائیاں تیز کرنے اور آپریشن شروع کرنے کے اعلانات سامنے آتے ہیں۔ نیشنل ایکشن پلان جسے تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اگر ہم اس پلان کے ۲۰ نکات پر طائرانہ نظر دوڑائیں تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان میں سے کن نکات پر عملدرآمد ہوا ہے یا ہو رہا ہے یا کن نکات پر ابھی کوئی پیش رفت ممکن نہیں ہو سکی۔

نیشنل ایکشن پلان کی کارکردگی پر بات کرنے سے پہلے اگر دہشت گردی کے واقعات پر نظر ڈالی جائے جو نیشنل ایکشن پلان کے بعد وقوع پذیر ہوئے تو صورتحال کچھ یوں نظر آتی ہے۔ ساؤتھ ایشین ٹیررازم پورٹل کے اعداد و شمار کر مطابق ۲۰۱۵ء میں پاکستان میں کل ۲۱۶ بم دھماکے ہوئے جن میں سے ایک آزاد کشمیر، ایک گلگت، پنجاب میں ۱۶، بلوچستان میں ۵۹، سندھ میں ۲۶، خیبر پختونخواہ میں ۳۹ جبکہ فاٹا میں ۷۱ تھے۔ ان دھماکوں میں زخمی ہونے والی کی تعداد تقریباً ایک ہزار اکیس ہے جبکہ لقمہ اُجل بننے والوں کی تعداد ۴۹۵ ہے۔ اس سال ۲۰۱۶ء میں مارچ کے آخر تک کل ۳۸ بم دھماکے ہوئے، ان میں سے ۹ فاٹا، ۷ خیبر پختونخواہ، ۱۰ بلوچستان، ۹ سندھ، ایک پنجاب میں، ایک گلگت بلتستان میں اور ایک کشمیر میں ہوا۔ ان دھماکوں میں زخمی ہونے والوں کی تعداد ۵۱۰ ہے جبکہ جاں بحق ہونے والوں کی تعداد ۱۶۸ تھی۔ اگر ملک میں دہشت گردی کے مختلف واقعات میں ہونے والی مجموعی ہلاکتوں کا جائزہ لیں تو سال ۲۰۱۵ء میں کل '۳۶۸۲' افراد مارے گئے جن میں سے ۲۴۰۳ دہشتگرد تھے جبکہ سال ۲۰۱۶ء میں ۳ اپریل تک '۶۹۴' اموات میں سے ۴۰۴ دہشتگرد ہیں۔ نیشنل ایکشن پلان کے نفاذ کے بعد بھی پاکستان میں سینکڑوں لوگ دھماکوں کی وجہ سے جاں بحق ہو چکے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ پاکستان میں پالیسیاں، لائحہ عمل اور آئین بنا لیے جاتے ہیں لیکن ان پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے مختلف پالیسیوں کا وقتاً فوقتاً تجزیہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ اسی بات کے پیش نظر ہم نیشنل ایکشن پلان کے تحت کئے گئے اقدامات کا ایک سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ مسلح افواج کی زیرنگرانی دہشتگردی کے مقدمات کی سماعت کے لیے فوجی عدالتیں قائم کرنا:

فوجی عدالتوں کے قیام کے پہلے مرحلے میں نو عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا گیا جن میں تین، تین عدالتیں خیبر پختونخواہ اور پنجاب میں، دو سندھ میں اور ایک بلوچستان میں قائم کی گئی۔ ان عدالتوں کے قیام اور ملزمان کو سزائیں دینے کے حوالے سے معلومات فراہم کرنے کے لئے انٹر سروسز پبلک ریلیشنز (آئی ایس پی آر) باقاعدہ پریس ریلیز جاری کر رہی ہے۔ ۱۲ دسمبر ۲۰۱۵ء کی پریس ریلیز کے مطابق اس وقت تک کل گیارہ فوجی عدالتیں قائم کی گئیں ہیں جن میں ۱۴۲ کیس بھیجے گئے۔ ان میں سے ۵۵ کیسوں کا فیصلہ سنایا جا چکا ہے جبکہ ۸۷ کیسوں میں ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے۔ ان فیصلوں کی روشنی میں ۳۱ دہشتگردوں کو سزائیں بھی سنائی جا چکی ہیں۔ جو سزائیں دی گئیں ان میں مؤرخہ ۲ اپریل ۲۰۱۵ء کو چھ ملزمان کو سزائے موت اور ایک کو عمر قید کی سزا، ۲ ستمبر ۲۰۱۵ء کو پانچ ملزمان کو سزائے موت اور ایک کو عمر قید اور مؤرخہ ۲۱ ستمبر ۲۰۱۵ء کو مزید ۹ ملزمان کو سزائے موت کی سزا سنائی گئی۔ یکم جنوری ۲۰۱۶ء کو ۹ ملزمان کو سزائے موت اور مؤرخہ ۱۱ فروری ۲۰۱۶ء کو ۱۲ ملزمان کو سزائے موت دی گئی۔ جیسے جیسے ضرورت محسوس کی

گئی مزید فوجی عدالتیں بھی قائم کی گئیں۔ نیشنل ایکشن پلان کے مطابق ان عدالتوں کی مدت دو سال ہے۔ فوجی عدالتوں کا قیام اس مسئلہ کا مستقل حل نہیں، لہذا ہمیں اپنی عدلیہ کو آزاد، خودمختار اور ذمہ دار بنانا چاہئے تاکہ سرحدوں کی حفاظت کرنے والے اداروں کو عدلیہ کے نظام میں معاونت کی ضرورت پیش نہ آئے۔

۲۔ سزائے موت پر عائد پابندی ختم کرنا

پاکستان میں سزائے موت پر عائد پابندی مکمل طور پر ختم کر دی گئی ہے۔ ملک میں سزائے موت دینے کا عمل جاری ہے اور ۲۰۱۴ء کے آخر سے فروری ۲۰۱۶ء تک ۱۳۵۱ افراد کی سزائے موت پر عملدرآمد ہو چکا ہے۔ پاکستان سزائے موت پر عملدرآمد کرنے والے ممالک کی فہرست میں تیسرے نمبر پر آ گیا ہے۔ حال ہی میں گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے قاتل ممتاز قادری کو پھانسی دی گئی جس پر احتجاج بھی کیا گیا۔ سزائے موت کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی تصور کیا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں ان افراد کو انسانی حقوق کی پامالی کے جرم میں سزا دی جا رہی ہے، اگر ان کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہمارے اور آپکے حقوق پامال ہوتے رہیں گے اور ہم اپنوں کی یوں ہی لاشیں اٹھاتے رہیں گے۔ بہر حال ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری عدالتیں سب کو یکساں انصاف فراہم کریں اور انصاف کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے مزید اقدامات کریں۔

۳۔ دہشتگردوں کو فنڈز فراہم کرنے والے ذرائع کا سدباب

اس سلسلے میں چند اقدامات اٹھائے گئے ہیں اور متعدد منی ایکسچینج کمپنیوں کو بند کیا گیا ہے اور کچھ کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ پاکستان میں کالعدم تنظیموں کے چندہ اکٹھا کرنے پر پابندی عائد کی گئی۔ مختلف تہواروں کے موقع پر اخبارات میں اشتہارات کے ذریعے عوام کو ان کالعدم گروہوں کے بارے میں آگاہ کیا گیا تاکہ لوگوں کے صدقات وعطیات ان تک نہ پہنچ سکیں۔ ان طریقوں سے بھی عوام کو باخبر کیا جاتا رہا جن کے ذریعے کالعدم تنظیمیں چندہ اکٹھا کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے بھی اقدامات اٹھائے گئے اور لوگوں میں شعور اجاگر کرنے کے لیے مہم چلائی گئی۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے فروری ۲۰۱۶ء تک ۲۵۱ ملین کیش قبضے میں لے چکے ہیں جبکہ اس ضمن میں ۱۲۶ بینک اکاؤنٹ بھی منجمد کیے گئے ہیں۔ دہشتگردوں کو فنڈ بھیجنے والے ذرائع کے سدباب اور نگرانی کے لیے ضروری ہے کہ ان اداروں پر بھی نظر رکھی جائے جو ہمارے مسلم دوست ممالک سے امداد لیتے ہیں اور اس امداد کو اپنے نظریات کے فروغ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ دہشت گرد تنظیموں کو کسی بھی صورت ملک میں سرگرم ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی

کالعدم تنظیموں کی سرگرمیوں پر کافی حد تک پابندی عائد کی جا چکی ہے۔ بلکہ حکومت کی جانب سے کالعدم قرار دیے جانے والے اداروں اور واچ لسٹ میں موجود اداروں کی فہرست میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ اب تک ۶۲ تنظیموں کو کالعدم قرار دیا جا چکا ہے۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کے ساتھ ساتھ جنوبی پنجاب جہاں کالعدم تنظیموں کی سرگرمیوں کے بینر، پوسٹر وغیرہ کھلے عام دکھائی دیتے تھے اب نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلاشبہ ان اداروں کی سرگرمیاں ابھی بھی جاری ہیں جن پر کڑی نگرانی کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں ایسے کالعدم ادارے ہیں جن کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ وہ نام تبدیل کر کے کام کر رہے ہیں، ان اداروں کے بارے میں بھی ایکشن لینے کی ضرورت ہے۔

۵۔ انسدادِ دہشتگردی کے لیے خصوصی فورس تشکیل دی جائے گی

انسدادِ دہشتگردی کے لیے پنجاب اور خیبر پختونخواہ میں انسدادِ دہشتگردی کے لیے فورسز بنائی جا چکی ہیں اور انہیں تربیت بھی فراہم کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے مختلف صوبوں میں مختلف فورسز جن میں ایلیٹ، رینجرز، انٹی ٹیررازم سکواڈ اور دیگر ادارے کام کر رہے ہیں۔ نئی فورسز تشکیل دینے کی بجائے ان کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے۔ ہر ایک مسئلہ سے نمٹنے کے لیے الگ فورس تشکیل دینے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔

۶۔ دینی مدارس کی رجسٹریشن کے لیے نظام تشکیل دیا جائے گا

دینی مدارس کی رجسٹریشن کے لیے ایک فارم بنایا گیا جو دینی مدارس کو بھیجا گیا تا کہ ان کی رجسٹریشن کو یقینی بنایا جا سکے۔ رجسٹریشن فارم کے ساتھ ان کو اپنے ادارے کی دستاویزات جمع کروانے کا بھی کہا گیا۔ رجسٹریشن کا عمل جاری ہے مگر تا حال سندھ میں تین ہزار مدارس ایسے ہیں جن کی رجسٹریشن جنوری ۲۰۱۶ء تک مکمل نہیں ہو سکی۔ دسمبر ۲۰۱۴ء سے مارچ ۲۰۱۶ء تک دہشتگردی کو فروغ دینے والے ۱۸۲ مدارس سیل کیے جا چکے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ دینی مدارس کی رجسٹریشن پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ملک میں کام کرنے والے ملکی اور بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں اور اداروں کو بھی رجسٹریشن نہ ہونے اور کاغذی دستاویزات مکمل نہ ہونے کی صورت میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی جا رہی۔

۷۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو دہشتگروں کے نظریات اور عقائد کی تشہیر کی اجازت نہیں دی جائے گی

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر کافی حد تک کالعدم تنظیموں کی سرگرمیوں کی نشر و اشاعت کو محدود کر دیا گیا ہے اور انہیں پابند بنایا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ کالعدم گروپوں کے لیڈروں کے بیانات، مختلف ٹاک شوز کے ذریعے ان کے نظریات کے فروغ پر بھی نمایاں کمی دیکھنے میں آ رہی ہے۔

۸۔ لٹریچر، اخبارات اور میگزین کے ذریعے فرقہ واریت، انتہا پسندی اور عدم رواداری کو پھیلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی

دہشتگردوں کو گرفتار کر کے ان سے کتب، رسائل، پوسٹر، پمفلٹ اور سی ڈیز وغیرہ قبضے میں لی گئیں۔ فروری ۲۰۱۶ء تک ملک بھر میں ۳۷ سے زیادہ ایسی دکانیں بند کروائی گئیں جو اشتعال انگیز مواد فروخت اور تقسیم کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ مارکیٹ سے ۱۵۰۰ کتابیں قبضے میں لی گئیں۔ مگر ابھی تک اس مواد پر مکمل قابو نہیں پایا جا سکا کیونکہ صورتحال اس طرح ہے کہ کالعدم تنظیمیں نام تبدیل کر کے اپنے طباعت خانے اور سکول چلا رہے ہیں اور ان کے اخبارات اور میگزین ابھی بھی شائع ہو رہے ہیں۔ صرف دکانیں بند کروانے یا شائع شدہ مواد قبضہ میں لینے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا کیونکہ بے شمار کتابیں، رسالے، آڈیو اور وڈیوز وغیرہ نیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔ انٹرنیٹ پر اس مواد کی اشاعت کیسے روکا جا سکتا ہے، اس حوالے سے پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔

۹۔ افغان مہاجرین کے مسئلہ کے حل کے لیے جامع حکمتِ عملی بنائی جائے گی

اس ضمن میں افغان مہاجرین کی وطن واپسی کے لئے کچھ اقدامات اٹھائے گئے ہیں مگر تا حال ابھی تک پیش رفت جاری ہے۔ افغان مہاجرین کی رجسٹریشن کے لیے بھی اقدامات کئے گئے ہیں۔ پاکستان نے افغان مہاجرین کی مزید میزبانی سے انکار کر دیا ہے اور بیشتر کو واپس ان کے ملک بھی روانہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کے پاس پاکستان کا قومی شناختی کارڈ ہے، انکے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے فوری اقدامات کی ضرورت ہے اور ان لوگوں کا بھی احتساب کیا جانا چاہئے جن کی بدولت انہوں نے پاکستان کا قومی شناختی کارڈ حاصل کیا۔ گزشتہ ۱۵ ماہ (۲۱ دسمبر ۲۰۱۵ء سے ۲۱ مارچ ۲۰۱۶ء تک) میں ۶۶۷ غیر قانونی افغان پناہ گزینوں کو کراچی سے گرفتار کیا گیا۔ ابھی اس حوالے سے ملکی اداروں کو مزید اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۰۔ انسداد دہشت گردی کے اداروں کو مضبوط بنانے کے لئے فوجداری عدالتی نظام میں اصلاحات لانا

اس حوالے سے کسی قسم کی اصلاحات ابھی تک منظر عام پر نہیں آ سکیں۔ اگر کوئی قدم اٹھایا بھی گیا ہے تو اسے عوام کے سامنے نہیں لایا گیا۔ دہشت گردوں کی تفتیش کے لئے اس جانب پیش رفت از حد ضروری ہے۔

۱۱۔ نیشنل کاؤنٹر ٹیررازم اتھارٹی (نیکٹا) کو فعال اور موثر بنایا جائے گا

نیکٹا کو فعال بنانے کے لئے اس ادارے کو جن اختیارات، سٹاف اور بجٹ کی ضرورت ہے وہ ابھی تک مہیا نہیں کیے گئے، تاہم اس حوالے سے کچھ پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس ادارے کو مکمل اختیارات دینے کے بعد ہی کچھ امید کی جاسکتی ہے کہ یہ ادارہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگا۔ ایک طویل عرصے کے بعد نیکٹا کی ویب سائٹ کو دوبارہ بحال کیا گیا مگر ویب سائٹ پر موجود ضروری معلومات جس میں کالعدم اداروں کے ناموں کی فہرست بھی شامل تھی، ہٹا دی گئی ہیں۔ اس وقت نیکٹا کی ویب سائیٹ پر کوئی بھی اہم معلومات یا پالیسی بیان موجود نہیں۔

۱۲۔ کراچی میں دہشتگردی کے خلاف جاری آپریشن کو منطقی انجام تک پہنچایا جائے گا

کراچی کے مختلف علاقوں میں گزشتہ سال سے آپریشن جاری ہے۔ کالعدم اور دہشتگرد تنظیموں کے سینکڑوں ممبران کو گرفتار کیا جا چکا ہے، اس کے ساتھ ساتھ جرائم پیشہ اور بھتہ خور عناصر کو بھی لگام ڈال دی گئی ہے۔ تاحال آپریشن جاری ہے اور اس کی مدت کا تعین ابھی نہیں کیا جا سکا۔ لیکن کراچی میں آپریشن کے بعد امن و امان کی صورتحال کو کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے اس حوالے سے بھی لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۳۔ دہشتگرد تنظیموں کے مواصلاتی نیٹ ورک کو مکمل طور پر ختم کیا جائے گا

دہشتگرد تنظیموں کا مواصلاتی نظام نہایت مضبوط ہے۔ اس نیٹ ورک کو توڑنے کے لئے پاکستان میں چند اقدامات اٹھائے گئے جن میں موبائل فون کی سم کو بائیومیٹرک کروانا اور نامعلوم فون سموں کو بلاک کرنا شامل ہے۔ اس کے علاوہ فون کالز کی معلومات پر مشکوک افراد کی گرفتاریاں بھی عمل میں لائی گئیں۔ دہشتگرد تنظیموں کے نیٹ ورک کو مکمل تباہ کرنے کے لئے ابھی کافی کام ہونا باقی ہے۔ روابط کے نئے طریقے متعارف ہونے کی وجہ سے دہشتگردوں کو ٹریس کرنا اور بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

۱۴۔ دہشتگردی کے لیے انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے استعمال کی روک تھام کے لیے اقدامات

سوشل میڈیا پر کالعدم تنظیموں، ان کی قیادت اور ارکان کے اکاؤنٹ موجود ہیں اور ان میں سے چند اکاؤنٹس بند بھی کیے جا چکے ہیں۔ مگر ابھی بھی سینکڑوں کی تعداد میں ایسے اکاؤنٹس، ویب سائٹس اور فیس بک صفحات موجود ہیں جہاں سے لوگ ان تنظیموں کے نظریات سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ منسٹری آف انفارمیشن کی جانب سے دہشتگرد تنظیموں کی ۱۰ ویب سائٹس اور ۹۳۷ یو آر ایل لنک اب تک بلاک کیے گئے ہیں۔ ویب سائٹس اور فیس بک صفحات کو بلاک کرنے کے علاوہ سوشل میڈیا پر کالعدم تنظیموں کے نظریات کا فروغ اور ان کی موجودگی کی مکمل مانیٹرنگ کی ضرورت ہے۔

۱۵۔ ملک کے کسی حصے میں انتہا پسندی کی کوئی گنجائش نہیں

لاہور گلشن اقبال پارک میں پیش آنے والے واقعہ کے بعد پنجاب بھر میں دہشتگردوں کے خلاف آپریشن شروع کر دیا گیا ہے اور سینکڑوں افراد گرفتار بھی کئے گئے ہیں۔ ملک کے مختلف اضلاع سے ہونے والی گرفتاریاں انتہا پسندی کے خاتمے میں اس وقت تک مددگار ثابت نہیں ہوں گی جب تک کہ انتہا پسندی کے اسباب اور انتہا پسندی کو فروغ دینے والے عناصر پر پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ اس وقت ملک میں انتہا پسندی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے جس کے لئے مناسب اقدامات کرنے ہوں گے۔

۱۶۔ فرقہ واریت پھیلانے والے عناصر سے سختی سے نمٹا جائے گا

فرقہ واریت کے الزام میں گرفتار ایک نوجوان کو فیس بک پر اشتعال انگیز پوسٹ شیئر کرنے پر ۱۳ سال قید سنائی گئی۔ اس کے علاوہ احمدیوں کے خلاف پوسٹر لگانے پر بھی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں ہیں۔ مارچ ۲۰۱۶ء تک لاؤڈ اسپیکر کے غلط استعمال پر ''۱۰۳۴۶'' کیس درج ہو چکے ہیں اور لاؤڈ اسپیکر کے ناجائز استعمال کی وجہ سے تقریباً ۱۰۵۹۷ افراد گرفتار ہوئے۔ ۲۴۷۷ کیس نفرت انگیز تقاریر کرنے والوں کے خلاف درج ہوئے تھے جبکہ ان نفرت انگیز تقاریر کرنے والوں میں سے ۲۳۵۸ افراد جنوری ۲۰۱۶ء کے آخر تک گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ فرقہ واریت کے خاتمہ کے لئے مصلحتوں سے بالاتر ہو کر ایسے سب عناصر کے خلاف کاروائی کرنے کی ضرورت ہے جو فرقہ واریت پھیلا رہے ہیں۔

۱۷۔ بے گھر افراد کی بحالی اور فاٹا میں انتظامی اور ترقیاتی اصلاحات کا نفاذ

آپریشن اور عسکریت پسندی کی وجہ سے فاٹا سے بے گھر ہونے والے افراد کی واپسی کے لئے حکومت مناسب اقدامات کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ جنگ سے متاثرہ علاقوں میں ترقیاتی کاموں پر بھی توجہ دی جاری ہے۔ سوائے چند کمیٹیوں کے فاٹا میں انتظامی اصلاحات پر ابھی کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی۔

۱۸۔ کالعدم تنظیموں کو کسی دوسرے نام سے کام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی

کالعدم تنظیموں اور اداروں کی لسٹ کو از سر نو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ نیکٹا اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ کالعدم تنظیموں کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جائے اور انہیں دوسرے ناموں سے فعال ہونے سے روکا جائے کیونکہ اس وقت بھی ملک کے مختلف علاقوں میں یہ تنظیمیں دیگر ناموں سے کام کر رہی ہیں۔

۱۹۔ مذہبی انتہا پسندی کا خاتمہ اور اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ

بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے حکومت کی جانب سے مزید اقدامات کی ضرورت ہے۔ سندھ میں سرکاری سطح پر ہولی کے تہوار کو منانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذاہب کے درمیان موجود اختلافات کو ختم کرنے اور ایک دوسرے کے تہواروں میں شامل ہونے کے حوالے سے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اقلیتوں میں احساس محرومی ختم کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

۲۰۔ تمام اسٹیک ہولڈرز کے ساتھ سیاسی مفاہمت کے لئے بلوچستان کی حکومت کو مکمل بااختیار بنانا

نیشنل ایکشن پلان کی اس شق کی روشنی میں بلوچستان میں جاری تصادم کو حل کرنے کے لیے بلوچستان کے سابق وزیراعلیٰ عبدالمالک نے بلوچستان کے ناراض گروہوں سے سیاسی مفاہمت کے لئے ملاقاتیں کیں۔ ناراض گروہوں کی جانب سے مفاہمت کے لئے کچھ شرائط عائد کی جا رہی تھیں۔ بلوچستان کے وزیراعلیٰ نے ان کی شرائط ماننے کی یقین دہانی کروائی۔ اسی دور میں فراریوں کو عام معافی دینے اور ان کو باعزت زندگی گزارنے کا حق دینے کا اعلان کیا گیا۔ اس پالیسی کے تحت چار ہزار فراریوں نے ہتھیار ڈالے۔ دسمبر ۲۰۱۵ء میں بلوچستان کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر عبدالمالک کے مستعفی ہونے کے بعد ثناءاللہ زہری نے وزیراعلیٰ کا عہدہ سنبھالا ہے۔ فروری ۲۰۱۶ء میں انہوں نے اعلان کیا کہ نیشنل ایکشن پلان پر عمل درآمد ہوگا۔ مگر اس نے سابقہ وزیراعلیٰ کی پالیسی تبدیل کرتے ہوئے بلوچ ناراض گروہوں کے سروں کی قیمت مقرر کر دی اور کسی بھی قسم کی بات چیت سے صاف انکار کر دیا۔ بلوچستان مسئلے کا حل بلوچستان حکومت کو بااختیار بنانے سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ سیاسی مفاہمت کے عمل میں تسلسل کو برقرار نہ رکھا جائے۔

حوالہ جات:

http://www.satp.org/satporgtp/countries/pakistan/database/bombblast2015.htm

http://www.satp.org/satporgtp/countries/pakistan/database/bombblast.htm

http://www.satp.org/satporgtp/countries/pakistan/database/fatilities_regionwise2016.htm

http://www.satp.org/satporgtp/countries/pakistan/database/fatilities_regionwise2015.htm

http://www.pakistantoday.com.pk/2016/04/06/uncategorized/766-illegal-afghan-refugees-arrested-in-karachi-in-past-15-months-report/

http://www.thenews.com.pk/print/94763-182-Madrassas-sealed-for-fanning-extremism

http://www.urduvoa.com/content/pakistan-ranks-third-worldwide-with-324-executions-in-2015/3197797.html

http://tribune.com.pk/story/1058813/25-year-old-jailed-for-13-years-over-facebook-post/

http://tribune.com.pk/story/1009503/two-arrested-for-putting-up-anti-ahmadi-posters/

http://www.thenews.com.pk/print/112842-Ministry-admits-slackness-in-implementing-NAP

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

پاناما ہنگامہ

تحریر: سندس سیدہ

ویسے تو پاکستان میں لوگ بھوک، غربت وافلاس کا شکار ہیں، نہ ہی ہماری عوام کے پاس پیسہ ہے اور نہ ہی حکومت کے پاس عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بجٹ۔ لیکن اچانک جب یہ خبر سامنے آئی کہ پاکستانیوں کے نام پر کل ۶۰۷ کمپنیاں بیرونِ ملک رجسٹرڈ ہیں تو عوام کے لئے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کے مطابق پاکستان کی اقتصادی شرح خطے میں موجود دیگر ممالک کے مقابلے میں سب سے کم ہے۔ ظاہری بات ہے کہ ان کمپنیوں کے لئے ان گنت پیسہ پاکستان سے باہر گیا اور اگر اس پیسہ پر ٹیکس دیا جاتا تو یقیناً پاکستان کی اقتصادی شرح بہتر ہوسکتی تھی۔ ایک جانب تو ہمارا وہ طبقہ ہے جو مفلسی کی زندگی گزر رہا ہے مگر پھر بھی کھانے پینے، ادویات اور ضروریاتِ زندگی کی ہر شے پر ٹیکس دیتا ہے۔ جبکہ دوسری جانب بیرون ممالک سرمایہ کاری کرنے والے بھی ہیں جن پر الزام ہے کہ آف شور کمپنیاں انہوں نے بدعنوانی کے پیسے سے خریدیں۔

اگر پاناما لیکس میں اب تک کے شائع شدہ پیپرز کے اعداد وشمار کا جائزہ لیں تو ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا واقعی ہمارے ملک کے لوگوں کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ ان کے نام پر بیرونِ ممالک میں کمپنیاں قائم ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے! تو یقیناً یہ پیسہ اسلام آباد یا کراچی کے لوگوں کے پاس ہی ہوگا، یا پھر حکومتی نمائندوں کے پاس، ان کے علاوہ بیرونِ ملک سرمایہ کاری کرنے میں کون دلچسپی رکھتا ہوگا؟ لیکن یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی ہے کہ صرف حکومت ہی نہیں بلکہ حزبِ اختلاف، جج، کاروباری افراد، سرکاری غیر سرکاری اداروں کے عہدیداران اور میڈیا کے لوگ بھی ہیں جن کے نام پر بیرونِ ملک کمپنیاں رجسٹرڈ ہیں۔ ان میں کتنی کمپنیاں ان افراد کے ذاتی نام پر ہیں اور کتنی ان کے خاندان کے نام پر ہیں وہ تمام نام پاناما لیکس کی فہرست میں موجود ہیں۔ آف شور کمپنیاں بدعنوانی کے پیسے سے خریدی گئیں ہیں یا قانونی طور پر، اس حوالے سے میڈیا میں اہم نکات سامنے لائے جارہے ہیں۔

پاناما لیکس کی فہرست میں ۱۱ مئی ۲۰۱۶ء تک جو انکشافات سامنے آئے ان پر ایک نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ بیرونِ ملک میں مقیم پاکستانیوں کی آف شور کمپنیاں بھی ہیں۔ جن میں سے ایک ایک کمپنی دبئی اور ریاض (سعودی عرب) میں مقیم پاکستانیوں کی جبکہ ۲ کمپنیاں لندن میں مقیم دو خواتین کی ہیں۔ اگر پاکستان کے مختلف علاقوں کے اعتبار سے ان کا تعین کیا جائے تو کراچی کے شہریوں کے نام پر کل ۲۱۹ کمپنیاں، لاہور ۱۲۶، اسلام آباد ۱۰۴ ہیں۔ اس کے علاوہ مرید کے، فیصل آباد، پشاور، راولپنڈی، خیبر ایجنسی، مالاکنڈ اور چناب نگر کے شہری بھی پاکستان میں سرمایہ لگانے کے بجائے بیرونِ ملک سرمایہ کاری کرنے کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چناب نگر کے ۷ شہریوں کی کمپنیاں بیرونِ ملک رجسٹرڈ ہیں۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بلوچستان میں رہنے والے یا تو اب تک جرابوں اور تکیوں کے غلافوں میں پیسے رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں یا ان کی ترجیحات کچھ اور ہیں۔ کیونکہ بلوچستان کے کسی بھی شہری کا نام پاناما لیکس میں موجود نہیں ہے۔ ہاں! یہ ممکن ہے کہ ۱۱۲ کمپنیاں ایسی ہیں جو کہ پاکستانیوں کی ہی ہیں لیکن شہر کا نام معلوم نہیں ان میں شاید بلوچستان کے لوگوں نے بھی سرمایہ کاری کی ہو۔

علاوہ ازیں ایک خوشگوار بات یہ ہے کہ ان میں سے ۱۵۳ کمپنیاں خواتین کے ناموں پر رجسٹرڈ ہیں، جن میں سب سے زیادہ ۱۲ کمپنیاں اسلام آباد کے ایک ہی خاندان کی دو خواتین سیدہ سکینہ بخاری اور سیدہ معصومہ بخاری کے نام پر چھ چھ کمپنیاں ہیں۔ جبکہ والیانی خاندان کے نام پر کل ۱۲ کمپنیاں ہیں جن میں سے ۸ خواتین کے نام پر ہیں۔ جبکہ ۶۶ کمپنیاں کراچی، ۱۲۲ اسلام آباد، ۲۲ لاہور کی خواتین کے نام پر اور ۳ کمپنیاں پشاور کی ایک ہی خاتون کے نام پر ہیں۔

پاناما کی اب تک کی لیکس کے مطابق ۸ نومبر ۱۹۸۸ء میں سب سے پہلے ۶ کمپنیاں پاناما میں راولپنڈی اور لاہور کے شہریوں نے رجسٹرڈ کروائیں۔ کمپنیاں رجسٹرڈ کروانے

کے بانیان میں دو خواتین کے نام بھی ہیں۔ ۱۹۸۸ء سے ۲۰۱۵ء تک کے ریکارڈ پر نظر دوڑائیں تو صرف ۱۹۹۱ء کا سال ایسا تھا جس میں کوئی کمپنی رجسٹرڈ نہیں ہوئی۔ سب سے زیادہ کمپنیاں جن کی تعداد ۴۷ ہے ۲۰۰۷ء میں رجسٹرڈ ہوئیں، جبکہ ۱۹۹۰ء میں محض ایک کمپنی رجسٹر ہوئی۔ اگر ان خاندانوں کی بات کی جائے جو بڑی تعداد میں آف شور کمپنیوں کے مالک ہیں تو ان میں سے بڑا نام سیف اللہ خان خاندان کا ہے جن کے نام پر کل ۶۶ کمپنیاں ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر بے شمار خاندان ہیں جنہوں نے اپنے اور بیوی بچوں کے نام پر بے شمار آف شور کمپنیاں قائم کی ہیں۔ بیرونِ ممالک سرمایہ کاری کی جانے والی رقم پر اگر پاکستانی مکمل ٹیکس ادا کر کے قانونی طور پر رقم باہر بھیجیں تو پاکستان کی معیشت بہتر ہو سکتی ہے۔ اسلام آباد، کراچی اور لاہور میں بسنے والے شہریوں کے ساتھ ساتھ چناب نگر، مالاکنڈ، مردے، خیبر ایجنسی اور دیگر شہروں کے لوگ بھی اپنے سرمائے کو پاکستان میں لگا کر یا اس پر ٹیکس دے کر پاکستان کی اقتصادی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

شہر	کمپنیوں کی تعداد	خواتین کے نام پر کمپنیاں
کراچی	219	66
اسلام آباد	104	22
لاہور	126	22
جن کے شہرمعلوم نہیں	112	26
راولپنڈی	10	4
گجرانوالہ	9	4
چناب نگر	7	1
پشاور	5	3
فیصل آباد	4	1
گجرات	3	2
خیبر ایجنسی	2	0
لندن	2	2
مرید کے	1	0
مالاکنڈ	1	0
دبئی	1	0
الریاض	1	0
کل کمپنیاں	607	153

خاندان	کمپنیوں کی تعداد
سیف خان کا خاندان	66
سیدہ بخاری کا خاندان	15
سید احمد کا خاندان	13
اعظم سلطان کا خاندان	13
والیاتی خاندان	12
داؤد خاندان	11
گوکال خاندان	10
سورتی خاندان	9
ڈیرو خاندان	8
لاکھانی خاندان	8
زمان خاندان	7
پوری خاندان	7
مرزا احمد کا خاندان	5
پراچہ خاندان	5
میاں خاندان	5
نواز شریف کا خاندان	5

کمپنیوں کی تعداد	سال
6	1988
4	1989
1	1990
14	1992
10	1993
19	1994
4	1995
7	1996
10	1997
38	1998
13	1999
39	2000
21	2001
14	2002
18	2003
18	2004
27	2005
27	2006
74	2007
27	2008
33	2009
17	2010
40	2011
25	2012
12	2013
45	2014
13	2015
41	جن کی رجسٹریشن کے سال معلوم نہیں
607	کل کمپنیاں

حوالہ:

https://www.geo.tv/latest/105452-Clarifications-from-Pakistanis-named-in-Panama-Papers#aqueela

مصنفہ انڈویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے
info@individualland.com

خواتین کے تحفظ کا بل

تحریر: ریحان علی

اب تک ہم ان مردوں کے بارے میں تشویش کا شکار تھے جو پنجاب میں خواتین کے تحفظ کے بل کی شدید مخالفت کر رہے ہیں۔ ان مرد حضرات کو یہ خوف لاحق ہے کہ اس بل سے پاکستان میں مردوں کا اثر و رسوخ کمزور پڑ سکتا ہے۔ ایسے حضرات جو اس بل کو معیوب قرار دیتے ہیں وہ اسے اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات سے انحراف سمجھتے ہیں، وہ مذہب جو نہ صرف دوسرے انسانوں کے ساتھ امن، احسان اور رحمت کا درس دیتا ہے بلکہ خواتین کے ساتھ ہر قسم کے تشدد کی بھرپور مخالفت کرتا ہے۔ لیکن یہ مضمون ایسے افراد کے بارے میں نہیں جو اپنی سیاست اور ووٹ بنک کے لئے ہر وقت شور برپا کئے رکھتے ہیں اور اصل حقیقت، مفروضے اور عوامی جذبات کے مابین کھینچی لائن کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ بلکہ یہ مضمون پاکستان کی ان تمام خواتین کے بارے میں ہے جن کے لئے یہ بل اور اس میں شامل قوانین وضع کئے گئے ہیں۔ یہ ان خواتین کے بارے میں ہے جو طویل عرصہ سے محکوم اور مظلوم ہیں اور جن کے ذہن میں ابتداء سے ہی یہ بات ڈال دی گئی ہے کہ وہ بیکار اور ناکارہ ہیں۔ ان کی قیمت کا اندازہ یا تو اس جہیز سے لگایا جاتا ہے جو ان کے والدین غربت کے باوجود اپنی عزت اور بھرم رکھنے کے لئے اپنی بیٹیوں کو دیتے ہیں، یا پھر اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ وہ شادی کے بعد اپنے خاوند کے لئے زیادہ سے زیادہ بچوں کو سنبھالنے کی کتنی اہلیت رکھتی ہیں۔ وہ عورتیں جن کو چھوٹی عمر میں ہی یہ سکھایا جاتا ہے کہ اس زمین پر ان کا مقصد اپنے شوہر کے بچوں کی دیکھ بھال اور ذمہ داری کے ساتھ ان کی پرورش، اور اپنے آپ کو بھول کر اپنے شوہر کے خاندان کا خیال رکھنا ہے۔ پاکستان میں صرف چند خواتین ان دقیانوسی تصورات کو غلط ثابت کر رہی ہیں جبکہ ابھی بھی اکثریت کے خلاف امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور انہیں کسی نہ کسی طرح جسمانی، مالی اور جذباتی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

اس بل کے حوالے سے جب ہم گفتگو کرتے ہیں، تو یہ بات ہمارے لئے تشویشناک ہے کہ اس بل کے نفاذ میں یہ مرد حضرات رکاوٹ نہیں جو اس بل کی پرزور مخالفت کر رہے ہیں بلکہ خود خواتین ہیں جن میں سے بعض تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اپنے دل میں یہ سوچ رکھتی ہیں کہ وہ بے بس اور بے وقعت ہیں۔ اور ان میں سے بعض ایسی ہیں جو یہ یقین رکھتی ہیں کہ یہ توہین آمیز تعلق اور رویے ان کی قسمت میں لکھ دیے گئے ہیں جن کا ان کو ہر صورت سامنا کرنا ہے۔ لہذا اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اکثر اوقات اپنے اوپر ظلم کرنے والوں، شوہروں یا ان کے خاندان کی خواتین سے خوف کا شکار نہیں ہوتیں بلکہ انہیں ایک انجانے خوف کا سامنا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر میں ان کی رپورٹ کروں گی یا انہیں چھوڑ دوں گی تو میرا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا میرے والدین میرے اس فیصلے کی حمایت کریں گے؟ کیا یہ میری پناہ گاہیں میرے یا میرے فیصلے کا تحفظ کریں گی اور اگر کرتی ہیں تو کب تک؟ اور اگر میرے لئے کوئی جائے پناہ نہ رہے اور میں سڑکوں پر آ جاؤں تو؟ یہ صرف ان خیالات کی ایک جھلک ہے جو تشدد زدہ ماحول میں رہنے والی عورت کے ذہن میں آتے ہیں۔ کیا حکومت واقعی ان خواتین کو اپنے خاندانوں سے تحفظ اور سلامتی کا یقین دلا سکتی ہے جو خون اور انتقام کے پیاسے ہیں؟

حکومت قانون سازی کے حوالے سے ایک تاریخی بل پاس کرنے کی خوشی میں اپنی تعریفوں کے پل باندھ سکتے ہیں لیکن اس کے نفاذ کی طرف بڑھنے کے لئے صدیوں پر محیط ثقافتی امتیازات کو مٹانے کے لئے ایک طویل سفر طے کرنا ہے۔اس کے لئے خواتین کو بااختیار بنانے کی ضرورت ہے تا کہ وہ اپنے حقوق سے آگاہ ہوں اور اپنے تحفظ کے لئے بنائے گئے قوانین کو استعمال کر سکیں۔ یہاں تک کہ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ طبقے اور جدید سوچ رکھنے والے گھرانوں میں بھی طلاق کی سختی سے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے،اور نوجوان لڑکیوں میں یہ سوچ پروان چڑھائی جاتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور خوابوں کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں اپنے شوہروں کی خواہشات کے ساتھ منسلک کر دیں۔ ہمارے معاشرے میں مذہبی بیانیہ صرف انہی واقعات پر توجہ مرکوز کرتا ہے جس میں مطیع اور فرمانبردار عورت کے کردار کو پیش کیا گیا ہو جو اپنے شوہر کو راضی رکھتی ہے۔ اور خواتین کی بہادری، حوصلہ مندی اور مالی خودمختاری کے وہ واقعات جو پیغمبر اسلام کے دور میں رونما ہوئے ان سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پیغمبر اسلام کی سب سے زیادہ محبوب زوجہ ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب کاروبار کرنے والی خاتون بھی تھیں۔ یہ ان کی زندگی کا ایسا پہلو تھا جس سے نبی نے انہیں کبھی منع نہیں فرمایا۔ہم اپنی بچیوں کو یہ سکھانے کی بجائے ان کے ذہنوں میں اطاعت اور سمجھوتے کی مثالیں کیوں ڈال رہے ہیں۔

میری ایک پروفیسر نے کلاس میں کہا تھا کہ ایک عورت ہی دوسری عورت کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔ مجھے ان کی اس بات کی جو بظاہر ایک نکتہ چینی تھی اس وقت سمجھ آئی جب میں نے ایک ماں کو اپنی بیٹی اور اس کے بچوں کو واپس اپنے اس شوہر کے پاس بھیجتے دیکھا جس نے اس عورت کی ہڈیاں توڑ کر اسے باہر گلی میں پھینک دیا تھا صرف اس وجہ سے کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرنے کے قابل نہیں تھی یا اس کا خیال نہیں رکھتی تھی۔ مائیں اپنی بچیوں کو اتنا مضبوط بنائیں کہ انہیں اپنے معاشرتی حقوق سے واقفیت حاصل ہو ۔انہیں مساوات اور یکساں انصاف کی ایک مثال قائم کرنا ہوگی۔ جب وہ اس پرتشدد ماحول سے چھٹکارا حاصل کریں گی تو اپنی بیٹیوں کو یہ ضرور سبق دیں گی کہ وہ اس قسم کے تشدد کو ہرگز برداشت نہ کریں۔ یہی ایک واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم عورتوں پر اس ظلم، امتیازی سلوک اور ثقافتی دباؤ کو کم سے کم کر سکتے ہیں تا کہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ معاشرے میں اس کی کتنی اہمیت ہے۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

داعش کی پاکستان میں موجودگی: ایک سوال

تحریر: سندس سیدہ

ایسے انتہا پسند ادارے جو ملک کی سالمیت کے لیے خطرے کا سبب بن سکتے ہیں ان کو حکومتِ پاکستان کی جانب سے مختلف اوقات میں کالعدم قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اسکے باوجود متعدد انتہا پسند تنظیمیں ہیں جن کو پاکستان میں ابھی تک کالعدم قرار نہیں دیا گیا۔ عالمی دہشت گرد تنظیم داعش کے حوالے سے حکومت نے اگرچہ مختلف اقدامات کئے ہیں اور اس تنظیم کو کالعدم قرار دیے جانے کے حوالے سے بھی چند خبریں آ چکی ہیں۔ داعش، آئی ایس، امارتِ اسلامیہ، دولتِ اسلامیہ یا اسلامک اسٹیٹ، ایک ہی تنظیم کے نام ہیں۔ اس وقت اس تنظیم کے حوالے سے درج ذیل سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔

۔ کیا داعش پاکستان میں موجود ہے؟

۔ داعش پاکستان میں کالعدم ہے یا نہیں؟

۔ پاکستان میں داعش کے حامیوں کے خلاف کیا اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں؟

۔ کیا برآمد ہونے والا داعش کا مواد پاکستان میں چھاپا جا رہا ہے؟

۔ پاکستان میں کون سی عسکری تنظیمیں داعش کے ساتھ کھڑی نظر آتی ہیں؟

داعش کا وجود پاکستان میں ہے یا نہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب حکومتِ پاکستان واضح طور دینا نہیں چاہتی یا اس کے لیے مناسب الفاظ تلاش کیے جا رہے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے حامی پاکستان میں موجود ہیں۔ انتہا پسند لیڈروں کی اندھی تقلید کرنے والے ان انتہا پسند تنظیموں سے کیسے متاثر ہوتے ہیں اس کا اندازہ ماضی میں ہونے والے دہشت گردی کے سینکڑوں واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ حکومتِ پاکستان کی جانب سے اس حوالے سے متضاد بیانات سامنے آتے رہے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں اس تنظیم کا کوئی اثر و رسوخ نہیں، حالانکہ پاکستان میں داعش کے نیٹ ورک پکڑے جانے اور ان کے پمفلٹ وغیرہ تقسیم کیے جانے کی خبریں سامنے آتی رہتی ہیں اور کبھی یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے حامی پاکستان میں موجود ہیں لیکن تنظیم موجود نہیں ہے۔

اس بات سے تو انکار ممکن نہیں کہ پاکستان میں جتنی کالعدم تنظیمیں ہیں ان کے ممبران داعش کے حامی اور معاون ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر ماضی پر نظر دوڑائیں آپ کو سینکڑوں کی تعداد میں پاکستانی القاعدہ اور افغان طالبان کے حامی نظر آئیں گے۔ اس کے علاوہ ہمسایہ ملک افغانستان میں بھی انتہا پسند تنظیم کے لیڈروں کے داعش میں شامل ہونے کے اعلانات سامنے آ رہے ہیں۔ افسوسناک صورتحال ہے کہ درخت اور اس کی جڑیں پہلے سے موجود ہیں۔ اس پر پیوند کاری کر کے اگر اسے پھل دینے کے قابل بنانا ہو تو دوبارہ بیج بونے اور تناور درخت بننے کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اسی لئے اگر داعش پاکستان میں اپنے قدم جماتی ہے جو کہ بظاہر آسان اور ممکن نظر نہیں آ رہا، پھر بھی ایسی صورتحال سے نمٹنے کے لیے ابتدائی اقدامات اٹھانے لازمی ہیں۔ جن تنظیموں کو کالعدم قرار دیا گیا ہے ان کے خلاف اس وقت بھرپور آپریشن جاری ہے۔ لیکن اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ان تنظیموں کے بارے میں بھی کوئی لائحہ عمل بنایا جائے جو انتہا پسند نظریات کو فروغ دے رہی ہیں اور ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ ہو سکتی ہیں مگر ان کو ابھی تک کالعدم قرار نہیں دیا گیا۔ اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ ان کے اراکین داعش میں شمولیت اختیار کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں داعش کو اسی طرح خطرہ مانا جارہا ہے جیسا کہ پوری عالمی دنیا میں۔ اسی لئے فورسز نے داعش سے تعلق رکھنے والے چند اراکین کی گرفتاریاں عمل میں لائی ہیں۔ ان پر کیا دفعات لگائی گئی ہیں اور ان کے خلاف کیسز کہاں چلائے جارہے ہیں، تفتیش کے دوران ان اراکین سے تنظیم کے حوالے سے کیا باتیں سامنے آئی ہیں، اس بارے میں ابھی کوئی تفصیلات منظر عام پر نہیں آئیں۔ پاکستان میں المیہ یہ ہے کہ یہاں صرف یہ خبر ملتی ہے کہ کالعدم تنظیم کے لیڈروں یا ممبران کو گرفتار کرلیا گیا ہے مگر اس کے بعد کی تفصیلات سے عوام کو باخبر نہیں رکھا جاتا۔ داعش کے پاکستان میں نیٹ ورک کے حوالے سے گرفتار افراد سے معلومات حاصل کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ یہ تنظیم پاکستان میں اپنے قدم نہ جما سکے۔

داعش کے پیغامات اور کامیابیاں کسی بھی انتہا پسند تنظیم کے لئے طاقت کا باعث بن سکتی ہیں۔ جیسا کہ بعض تنظیمیں جو ماضی میں القاعدہ کے ساتھ تھیں اب وہ عالمی جہاد کے فروغ کے لئے داعش کی صفوں میں کھڑے نظر آرہی ہیں۔ حکومت کے نمائندوں کی جانب سے ایسے بیانات ضرور سامنے آئے ہیں کہ داعش کے ساتھ کسی کو بھی روابط قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے جو انتہا پسند تنظیمیں پاکستان میں کام کرتی رہی ہیں یا انتہا پسند نقطہ نظر رکھنے والوں کے جن تنظیموں کے ساتھ روابط رہے ہیں، کیا وہ اجازت لے کر یہ کام کرتے رہے ہیں؟ کیا ہمارے ادارے اتنے خودمختار، خود اعتماد اور قابل ہیں کہ وہ کسی بھی انتہا پسند تنظیم کی جانب سے لاحق خطرات سے نمٹ سکیں؟ اگر ایسا ہے تو ان انتہا پسند تنظیموں کے لیے اس زمین کو تنگ کردیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی لائحہ عمل پر عملدرآمد ہورہا ہے اور اس سلسلے میں بے شمار اقدامات اٹھائے گئے ہیں، جن میں کالعدم اداروں کے اثاثے منجمد کرنے سمیت ان کی ہر قسم کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جارہی ہے۔ پاکستانی میڈیا نے بھی ان تنظیموں کی کوریج پر ازخود پابندی لگادی ہے۔ پاکستان میں انسدادِ دہشتگردی کے ذمہ دار ادارے اس حوالے سے جو اقدامات اٹھا رہے ہیں ان میں کیا پیش رفت ہو رہی ہے اس حوالے سے کوئی معلومات دستیاب نہیں، جس کی وجہ سے عام لوگوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ ادارے صحیح طرح سے کام نہیں کررہے۔ عوام کے نزدیک یہ ادارے اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام ہیں کیونکہ ان کے پاس وہ اختیارات موجود ہیں جس کو بروئے کار لاکر وہ دہشت گردی کو کم کرنے میں حکومت کی مدد کرسکیں۔ ہمارے ذمہ دار اداروں کو چاہئے کہ وہ اپنی ویب سائیٹ پر ایسی تمام معلومات دیں کہ انہوں نے اب تک کتنی کامیابیاں حاصل کی ہیں تاکہ ان اداروں پر لوگوں کا اعتماد بحال کیا جاسکے۔

داعش کے متعلق جو مواد پاکستان کے مختلف علاقوں سے قبضہ میں لیا گیا ہے اس کے بارے میں یہ تفصیلات جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ کہاں چھاپا جارہا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ پاکستان میں ہی چھاپا جارہا ہو مگر ہم باخبر نہ ہوں۔ اگر ایسا نہیں تو یہ مواد کہاں سے اور کس طریقے سے پاکستان آیا اور کن افراد کے ذریعے تقسیم کیا گیا اس بارے میں کھوج لگانے کی فوری ضرورت ہے۔ ان باتوں کو بھی مدِنظر رکھنا چاہئے کہ برآمد ہونے والے مواد میں کن نظریات کو فروغ دیا جارہا ہے؟ کن بنیادوں پر ان نظریات کی ترویج کی جارہی ہے؟ کیا یہ مواد لوگوں کو متحرک کرنے، ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے اور بھرتی کرنے کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال ہوسکتا ہے؟ متبادل بیانیہ کے لئے اور انتہا پسندی کے انسداد کے لئے داعش کے اس مواد کا تجزیہ کرنا اہم ہے۔

اس حوالے سے بھی ہمیں غور کرنا ہوگا کہ داعش اس وقت کتنا بڑا خطرہ ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ وسیع ترین انتہا پسند گروہوں کے نیٹ ورک میں شمار ہوتا ہے جو مزید علاقوں میں پھیلتا جارہا ہے۔ تنظیم کا مقصد پوری دنیا میں اپنا رعب اور دبدبہ بٹھانا ہے۔ یہ تنظیم جو اپنے آپ کو اسلامی ریاست گردانتی ہے، اسے ابھی تک کسی بھی ملک نے تسلیم نہیں کیا نہ ہی کوئی اسے تسلیم کرے گا۔ عالمی ردعمل کے نتیجے میں کسی بھی ملک میں اب اس تنظیم کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہے۔ دنیا بھر کے انتہا پسند داعش میں شمولیت کے لیے اپنے اپنے ممالک سے عراق اور شام کی جانب جارہے ہیں۔ اگر شام اور عراق کے حالات دیکھیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عسکریت پسند تنظیم کسی خاص فرقے کی نہیں بلکہ انسانیت کی شدید دشمن ہے۔ اس انتہا پسند تنظیم کے ظالمانہ اقدامات کی اسلام کے اندر کسی بھی فرقے میں اجازت نہیں۔ پاکستان میں عوام کو یہ شعور دلانے کی ضرورت ہے کہ ان کے اندر وہ کون سی تنظیمیں اور ادارے ہیں جو اسلام کے نام پر انتہا پسندی اور ملک دشمن سرگرمیوں کو فروغ دے رہے ہیں۔ اس حوالے سے حکومت کی دلچسپی اس بات سے عیاں ہوتی ہے کہ ابھی تک ملک کے ادارے کالعدم تنظیموں کی متفقہ لسٹ تیار کرکے عوام کے سامنے نہیں لاسکے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی
حیثیت سے کام کررہی ہیں
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

عوام کی نمائندگی کون کرے گا؟

تحریر: ذوالفقار حیدر

حال ہی میں پاکستان براڈکاسٹرز ایسوسی ایشن (پی بی اے) اور پاکستان ایڈورٹائزرز سوسائٹی (پی اے ایس) نے اپنے مشترکہ مفادات کے تحفظ کے لئے ایک کمیٹی قائم کی ہے جسے جوائنٹ انڈسٹری کمیٹی کا نام دیا گیا۔ اس کمیٹی کا مقصد ٹیلی وژن کے ناظرین کی صحیح تعداد اور ترجیحات کو جاننے کے لئے ایک مستند، قابل اعتماد اور دھاندلی سے پاک میکانزم ترتیب دینا ہے۔ کمیٹی میں دونوں اداروں کو نمائندگی دی گئی ہے اور دونوں اطراف کے اہم ذیلی ادارے اس کمیٹی کا حصہ ہیں۔ اینگرو فوڈز کے سابقہ چیف ایگزیکٹو سرفراز رحمان کو اس کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا گیا ہے۔ یہ کمیٹی ٹی وی چینلز اور ذرائع ابلاغ کے دیگر اداروں میں مسابقت کو بہتر بنانے اور اس میں شفافیت لانے کے لئے اپنی سفارشات پیش کرے گی۔

قارئین کی معلومات کے لئے عرض کرتا چلوں کہ پاکستان میں ٹی وی کے ناظرین کی ترجیحات کو ماپنے کی خاطر ۲۰۰۷ میں میڈیا لاجک نامی کمپنی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کمپنی کا مقصد پہلے سے زیادہ تفصیلی، درست اور بروقت معلومات فراہم کر کے ٹی وی چینلز کے ناظرین کی ترجیحات کا تعین کرنا تھا۔ اس ادارے کے قیام میں پاکستان ایڈورٹائزرز سوسائٹی (پی اے ایس) نے مرکزی کردار ادا کیا۔ بلاشبہ اس ادارے کے قیام اور اس سے حاصل کردہ معلومات کا سب سے زیادہ فائدہ بھی پاکستانی ایڈورٹائزرز ایجنسیوں یا اُن بڑے بڑے کارپوریٹ اداروں کو ہی ہوتا ہے جن کے اشتہارات صبح شام ہماری ٹی وی اسکرینوں پر چلتے ہیں۔ کمپنی نے آغاز میں تین بڑے شہروں لاہور، کراچی اور اسلام آباد میں ۵۰۰ سے زائد میٹر نصب کیے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق میڈیا لاجک اب بیس سے زائد شہروں سے ڈیٹا اکٹھا کرتی ہے۔ اس ڈیٹا میں ٹی وی دیکھنے والے کی عمر، پیشہ، آمدن اور تعلیم کے بارے میں بھی اعداد و شمار شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ معلومات میڈیا لاجک کے لاہور آفس میں جمع ہوتی ہیں اور پھر پروسیسنگ کے بعد یہ معلومات براڈکاسٹرز اور ایڈورٹائزرز کو فراہم کی جاتی ہے۔ چینل کی ریٹنگ اسی معلومات کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور پھر جس چینل کی ریٹنگ سب سے زیادہ ہوتی ہے اسے اشتہارات بھی زیادہ ملتے ہیں اور یوں اسے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کا موقع ملتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ایک ایسی دھاندلی سامنے آئی جس نے ریٹنگ کے اس طریقہ کار کا

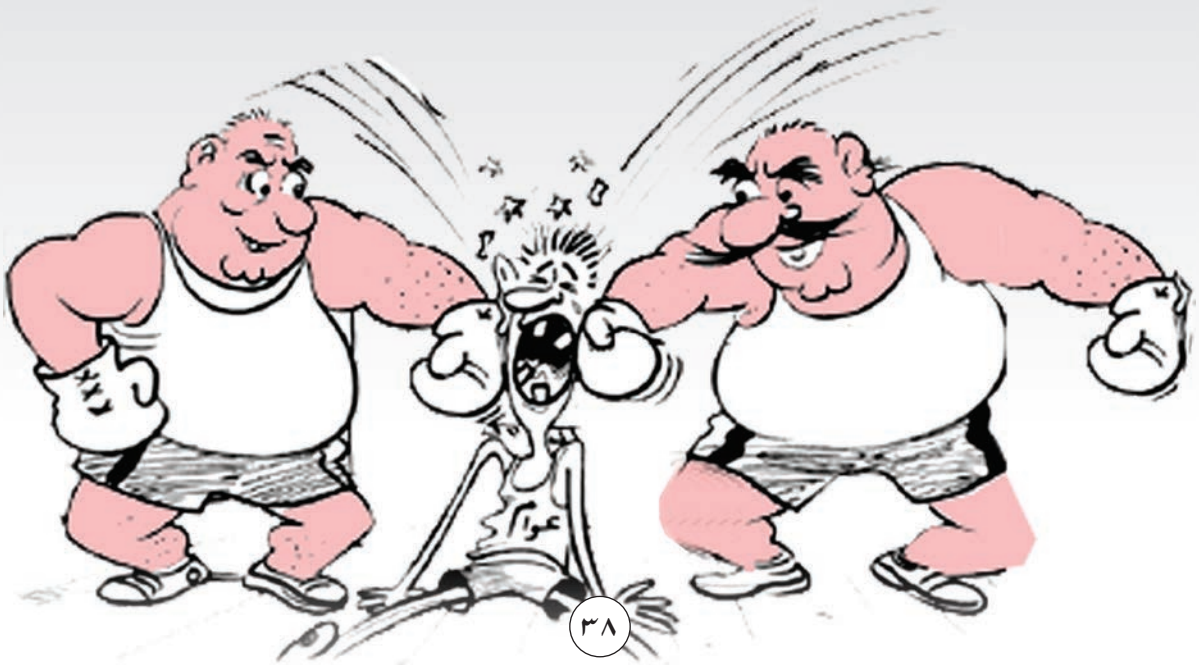

بھانڈہ پھوڑ دیا، جب ایک نجی ٹی وی چینل کی جانب سے اپنی ریٹنگ کو دوسرے چینلز سے بہتر بنانے کی خاطر میڈیا لا جک کے ملازمین اور وہ صارفین جن کے گھروں پر ریٹنگ میٹر نصب کئے گئے تھے، کو رشوت دینے کا واقعہ منظر عام پر آیا۔ پاکستان براڈ کاسٹرز ایسوسی ایشن نے اس معاملے کا سختی سے نوٹس لیا اور اس چینل کے خلاف کاروائی کی۔ ٹی وی چینلز پر پہلے بھی اس طرح کے الزامات لگتے رہتے تھے، لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ کسی چینل کے خلاف یہ الزامات ثابت ہوئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس غیر قانونی عمل کے ذریعے اس نجی چینل نے تقریباً چار سو سے پانچ سو ملین روپے ماہانہ کمائے۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ یہ چینل اب بھی اپنی نشریات پیش کر رہا ہے اور اس کیس میں کیا پیش رفت ہوئی، کوئی نہیں جانتا۔

پاکستان براڈ کاسٹرز ایسوسی ایشن (پی بی اے)، پاکستان ایڈورٹائزرز سوسائٹی (پی اے ایس) اور میڈیا لا جک کے اس کھیل پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ ایک تو یہ کہ ملک کے مختلف شہروں میں ریٹنگ کے لئے نصب میٹرز کی تعداد بہت کم ہے اور یہ تعداد ملک کی کل آبادی کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اس چیز کا ادراک میڈیا لا جک کے چیف ایگزیکٹو سلیم دانش کو بھی ہے لیکن اس میں بہتری کے حوالے سے کوئی عملی قدم ابھی تک نہیں اٹھایا گیا۔ اس کے علاوہ صرف ویورشپ کے نمبرز اور تعداد کو چینلز کی ریٹنگ کے لئے بنیاد بنانا کافی نہیں، خاص طور پر ان چینلز کے لئے جو صرف خبریں نشر کرتے ہیں۔ اس ریٹنگ کے لئے صحافتی اقدار کی اہمیت سے بھی نظریں نہیں چرائی جا سکتیں۔ کیبل آپریٹرز اور چینلز کی پوزیشننگ بھی اس معاملے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ ایسی خبریں بھی سامنے آ رہی ہیں کہ بعض چینلز والے کیبل آپریٹرز پر اثر انداز ہو کر اپنے چینلز کی پوزیشن تبدیل کرواتے رہتے ہیں جو براہ راست ناظرین پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس طرح لامحالہ میڈیا لا جک جیسی کمپنیوں کی حاصل کردہ معلومات بھی تبدیل ہو جاتی ہیں اور کوئی ایک چینل اس سے زیادہ فائدہ حاصل کر لیتا ہے۔

یقیناً جوائنٹ انڈسٹری کمیٹی ایک اچھے مقصد کے تحت قائم کی گئی ہے مگر اس کمیٹی کو ناظرین سے متعلق اعداد و شمار میں ہیر پھیر پر بھی توجہ دینی چاہئے۔ تمام چینلز کو اس قسم کی دھاندلی کرنے سے سختی سے روکا جائے۔ تمام ٹی وی چینلز ریٹنگ بڑھانے کی بجائے ملک کے تہذیب و تمدن اور ثقافتی اقدار پر بھی توجہ دیں تا کہ ناظرین کو اچھا مواد دیکھنے کو ملے اور اُن سے حاصل کردہ معلومات اُن کی صحیح ترجیحات کی عکاسی کرے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ ایسی کمیٹی میں عوام کو بھی نمائندگی دی جائے تا کہ اس کمیٹی کی جانب سے جو سفارشات پیش ہونی ہیں ان میں عوامی رائے کو بھی شامل کیا جا سکے۔ اس اشتراک سے نہ صرف اس کمیٹی کہ اہمیت میں اضافہ ہوگا بلکہ پی اے ایس اور پی بی اے کے مفادات کے ساتھ ساتھ عوامی مفادات کے تحفظ کو بھی یقینی بنایا جا سکے گا۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

شکییاں

حکومت اور احتساب

نوجوانوں سے متعلق

ادارے سے آگاہی

انڈو یجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک ، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش رجسٹرڈ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات ، قانون کی بالادستی ، میڈیا اور مراسلاتی ، ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔

اشاعت

میڈیا سے متعلق

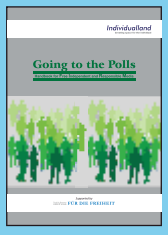

تنازعاتی تجزیے اور انتہا پسندی کے خاتمے سے متعلق

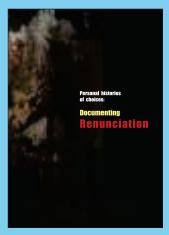

فرد میگزین

پاکستان پولیس خواتین

اگلی اشاعت اکتوبر ۲۰۱۶ میں

Find us
Individualland
Individualland